امراؤ جان ادا

مرزا ہادی رُسوا

"ہمارے ناول نہ ٹریجڈی ہیں نہ
کامیڈی، نہ ہمارے ہیرو تلوار سے قتل ہوتے
ہیں نہ ان میں سے کسی نے خودکشی کی ہے، نہ
ہجر ہوا ہے نہ وصل، ہمارے ناولوں کو موجودہ
زمانہ کی تاریخ سمجھنا چاہیئے۔

مرزا ہادی رسوا

☆

ہم کو بھی کیا کیا مزے کی داستانیں یاد تھیں
لیکن اب تمہید ذکرِ دردِ ماتم ہوگئیں

ناظرین! شانِ نزول اِس قصے کی یہ ہے کہ دس بارہ برس کا ذکر ہے میرے ایک دوست منشی احمد حسین صاحب اطرافِ دہلی کے رہنے والے بطریق سیر وسیاحت لکھنؤ میں تشریف لائے تھے۔ انہوں نے چوک میں سید حسین کے پھاٹک کے پاس ایک کمرہ کرایہ کو لیا تھا۔ یہاں اکثر احباب سرِ شام آبیٹھتے تھے بہت ہی لطف کی صحبت ہوتی تھی۔ منشی صاحب کا مذاقِ شعر فہمی اعلیٰ درجہ کا تھا۔ خود بھی کبھی کبھی کچھ کہہ لیتے تھے اور اچھا کہتے تھے لیکن زیادہ تر ان کو سُننے کا شوق تھا۔ اس لیے اکثر شعروسخن کا چرچا رہتا تھا۔ اسی کمرے کے برابر ایک اور کمرہ تھا۔ اس میں ایک طوائف رہتی تھی۔ بود وباش کا طریقہ اور رنڈیوں سے بالکل علیٰحدہ تھا۔ نہ کبھی کسی نے کمرے پر سرِ راہ بیٹھے دیکھا نہ وہاں کسی کی آمد ورفت تھی۔ دروازوں میں دن رات پر دے پڑے رہتے تھے۔ چوک کی طرف نکاس کا راستہ بالکل بند رہتا تھا۔ گلی کی جانب ایک اور دروازہ تھا۔ اسی سے نوکر چاکر آتے جاتے تھے۔ اگر کبھی کبھی رات کو گانے کی آواز نہ آیا کرتی تو یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ اس کمرے میں کوئی رہتا بھی ہے یا نہیں۔ جس کمرے میں ہم لوگوں کی نشست تھی اس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی لگی تھی مگراس میں کڑا پڑا ہوا تھا۔

ایک دن حسبِ معمول احباب کا جلسہ تھا، کوئی غزل پڑھ رہا تھا۔ احباب داد دے رہے تھے، اتنے میں میں نے ایک شعر پڑھا، اُس کھڑکی کی طرف سے واہ کی آواز آئی۔ میں چپ ہوگیا اور احباب بھی اُسی طرف متوجہ ہوگئے۔ منشی احمد حسین نے پکار کے کہا: ”غائبانہ تعریف ٹھیک نہیں؟ اگر شوقِ شعروسخن ہے تو جلسہ میں

تشریف لایئے۔'' اس کا کوئی جواب نہ ملا۔ میں پھر غزل پڑھنے لگا۔ بات رفت گزشت ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک مہری آئی۔ اس نے سب کو سلام کیا پھر یہ کہا، ''مرزا رسوا کون صاحب ہیں؟'' احباب نے مجھے بتا دیا۔

مہری نے کہا۔ بیوی نے ذرا آپ کو بلایا ہے۔

میں نے کہا، کون بیوی؟

مہری نے کہا، بیوی نے کہا دیا ہے، نام نہ بتانا، آگے آپ کا جو حکم ہو۔

مجھے مہری کے ساتھ جانے میں تامل ہوا، احباب مجھ سے مذاق کرنے لگے۔

''ہاں صاحب کیوں نہیں، کبھی صاحب سلامت ہے جب تو اس طرح بلا بھیجا۔

میں دل میں غور کر رہا تھا کہ کون صاحبہ ایسی بے تکلف ہیں، اتنے میں اُدھر مہری نے کہا حضور بیوی آپ کو اچھی طرح جانتی ہیں جب تو بلا بھیجا ہے۔ آخر جانا ہی پڑا۔

جانے کے جو دیکھا معلوم ہوا۔ آہا! امراؤ جان صاحب تشریف رکھتی ہیں۔

امراؤ جان:۔ (دیکھتے ہی) اللہ مرزا صاحب آپ تو ہمیں بھول ہی گئے۔

میں:۔ یہ معلوم کسے تھا کہ آپ کس کوہِ قاف میں تشریف رکھتی ہیں۔

امراؤ جان:۔ یوں تو میں اکثر آپ کی آواز سنا کرتی تھی مگر کبھی بلانے کی جرأت نہ ہوئی۔ مگر آج آپ کی غزل نے بے چین کر دیا۔ بے ساختہ منہ سے واہ نکل گیا، اُدھر کسی صاحب نے کہا، یہاں آیئے۔ میں اپنی جگہ پر آپ ہی شرمندہ ہوئی۔ جی میں آیا چپ ہو رہوں۔ مگر دل نہ مانا۔ آخر اگلی خصوصیتوں کے لحاظ سے آپ کو تکلیف دہی — ہاں وہ شعر ذرا پھر پڑھ دیجئے۔

میں:۔ معاف تو کچھ بھی ہو گا اور نہ میں شعر سناؤں گا۔ اگر آپ کو شوق ہے تو وہیں تشریف لے چلیے۔

امراو جان:۔ مجھے چلنے میں کوئی عذر نہیں مگر خیال ہے کہ صاحبِ خانہ یا اور کسی صاحب کو میرا جانا ناگوار نہ ہو۔

میں:۔آپ کے حواس درست ہیں؟ بھلا ایسی جگہ میں آپ کو چلنے کے لیے کیوں کہتا: بے تکلف صحبت ہے آپ کے جانے سے اور لطف ہوگا۔

امراو جان:۔یہ تو سچ ہے مگر کہیں زیادہ بے تکلفی نہ ہو۔

میں:۔جی نہیں، وہاں میرے سوا کوئی آپ سے بے تکلف نہیں ہوسکتا۔

امراو جان:۔اچھا تو کل آؤں گی۔

میں:۔ابھی کیوں نہیں چلتیں؟

امراو:۔اے ہے! دیکھیے تو کس حیثیت میں بیٹھی ہوں۔

میں:۔وہاں کوئی مجرا تو نہیں ہے، بے تکلف صحبت ہے چلی چلیے۔

امراو:۔اوئی مرزا! آپ کی تو باتیں لاجواب ہوتی ہیں، اچھا چلیے میں آتی ہوں۔

میں اٹھ کر چلا آیا۔تھوڑی دیر کے بعد امراو جان صاحبہ ذرا کنگھی چوٹی کر کے کپڑے بدل کے آئیں۔

میں نے احباب سے چند الفاظ میں ان کے مذاقِ شعروسخن اور کمالِ موسیقی وغیرہ کی تعریف کر دی تھی۔لوگ مشتاق ہو گئے تھے۔جب وہ تشریف لائیں تو یہ ٹھہری کہ سب صاحب اپنا اپنا کلام پڑھیں اور وہ بھی پڑھیں۔خلاصہ یہ کہ بڑے لطف کا جلسہ ہوا۔اُس دن سے امراو جان اکثر شام آتی تھیں۔گھنٹہ دو گھنٹہ نشست رہتی تھی۔کبھی شعر شاعری کا جلسہ ہوا کبھی انہوں نے کچھ گایا۔احباب محظوظ ہوئے۔ایسی ہی جلسے کی کیفیت ہم یہاں لکھے دیتے ہیں۔ان مشاعروں میں نہ کوئی طرح مقرر جاتی تھی اور نہ بہت سے لوگوں سے وعدے لیے جاتے تھے۔صرف بے تکلف احباب جمع ہو جاتے تھے اور اپنی اپنی تازہ تصنیف غزلیں پڑھتے تھے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

مشاعرہ

کس کو سنائیں حالِ دلِ زار اے آدا
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

مرزا رسوا:۔ کیا کہنا ہی امراو جان صاحب۔ یہ مقطع تو آپ نے حسبِ حال کہا ہے او رشعر کیوں نہ ہوں۔

امراو جان:۔ تسلیم مرزا صاحب! آپ کے سر کی قسم بس وہ مطلع یاد تھا او ر مطلع خدا جانے کس زمانے کی غزل کا ہے، زبانی کہاں تک یاد رہے بیاض نگوڑی گم ہوگئی۔

منشی صاحب:۔ اور وہ مطلع کیا تھا، ہم نے نہیں سنا۔

رسوا:۔ آپ تو اہتمام میں مصروف ہیں سنے کون؟

اس میں شک نہیں کہ منشی صاحب نے آج کے جلسے کے لیے بڑے سلیقے سے انتظام کیا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے، مہتابی پر دو گھڑی دن رہے چھڑکاو ہوا تھا تا کہ شام تک، زمین سرد رہے۔ اسی پر دری بچھا کے اجلی چاندی کا فرش کر دیا گیا تھا۔ کوری کوری صراحیاں پانی بھر کے کیوڑہ ڈال کے منڈیر پر چنوا دی گئی تھیں۔ ان پر بالو کے آبخورے ڈھکے ہوئے تھے، برف کا انتظام علیحدہ کیا گیا تھا۔ کاغذی ہنڈیوں میں سفید پانوں کی سات سات گلوریاں سرخ صافی میں لپیٹ کر کیوڑے میں بسا کر رکھ دی گئی تھیں۔ ڈھکینوں پر تھوڑا تھوڑا کھانے کا خوشبودار تمباکو رکھ دیا تھا۔ ڈیڑھ خم حقوں کے نیچوں میں پانی چھڑک چھڑک کر ہار لپیٹ دیئے تھے، چاندنی رات تھی اس سے روشنی کا انتظام زیادہ نہیں کرنا پڑا صرف ایک سفید کنول[۲] دورے کے لیے روشن کر دیا گیا تھا۔ آٹھ بجتے بجتے سب احباب، میر صاحب، آغا صاب، خان صاب، شیخ صاحب، پنڈت صاحب وغیرہ وغیرہ تشریف لائے۔ پہلے شیر فالودہ کے ایک ایک پیالے کا دور چلا پھر شعر و سخن کا چرچا ہونے لگا۔

منشی صاحب: ۔تو پھر اہتمام آپ کیجئے بندہ شعر سنے گا۔

رسوا: ۔معاف فرمائیے، یہ دردِ سر مجھ سے نہ ہو گا۔

منشی صاحب: ۔اچھا وہ مطلع کیا تھا؟

امراو: ۔میں عرض کیے دیتی ہوں

کعبے میں جا کے بھول گیا راہ دیر کی
ایمان بچ گیا مرے مولا نے خیر کی

منشی صاحب: ۔خوب کہا۔

خان صاحب: ۔اچھا مطلع کہا ہے مگر یہ "بھول گیا" کیوں؟

امراو جان: ۔تو کیا خان صاحب میں ریختی کہتی ہوں؟

خان صاحب: ۔مزہ تو ریختی کا ہے "مرے مولا نے خیر کی" آپ ہی کی زبان سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔

رسوا: ۔بس آپ کے حملے شروع گئے۔ مجھے شعر سننے دیجیے۔ خان صاحب اگر سب آپ ہی کے سے محقق ہو جائیں تو شعر گوئی کا مزہ تشریف لے جائے ع

ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است

خان صاحب: ۔(کسی قدر برے تیوروں سے) درست۔

رسوا: ۔امراو جان! اچھا تو کوئی اور غزل پڑھو۔

امراو: ۔دیکھیے کچھ یاد آئے تو عرض کروں (تھوڑی دیر کے بعد)

شب فرقت بسر نہیں ہوتی

حضارِ جلسہ: ۔واہ سبحان اللہ کیا کہنا۔

امراو جان: ۔(تسلیمیں کر کے) یہ شعر ملاحظہ ہو۔

شورِ فریاد تا فلک پہنچا
مگر اس کو خبر نہیں ہوتی

رسوا:۔کیا شعر کہا۔حضار نے بھی تعریف کی)

امراو:۔آپ کے عنایت۔تسلیم تسلیم۔

ترے کوچے کے بے نواؤں کو
ہوسِ مال و زر نہیں ہوتی

احباب:۔تعریف:

امراو:۔تسلیم

جان دینا کسی پہ لازم تھا
زندگی یوں بسر نہیں ہوتی

رسوا:واہ خان صاحب یہ شعر ملاحظہ ہو۔

خان صاحب:۔سبحان اللہ! حقیقت میں کیا شعر کہا ہے

امراو:تسلیم آپ سب صاحب قدر افزائی فرماتے ہیں ورنہ میں کیا مری حقیقت کیا،

ہے یقیں وہ نہ آئیں گے پھر بھی
کب نگہ سوئے در نہیں ہوتی

خاں صاحب:۔یہ بھی خوب کہا۔

پنڈت صاحب:۔کیا طرزِ کلام ہے۔

امروا:تسلیم کر کے۔

اب کس امید پر نظر میری
شکوہ سنجِ اثر نہیں ہوتی

خان صاحب:۔کیا اچھا کہا ہے۔فارسیت ٹپک رہی ہے۔

منشی صاحب:۔جو کچھ ہو،مضمون اچھا ہے۔امراو:تسلیم۔

ہم اسیرانِ عشق کو صیاد
ہوسِ بال و پر نہیں ہوتی

احباب:۔تعریف

امراو:۔تسلیم۔

غلط انداز ہی سہی وہ نظر
کیوں مرے حال پر نہیں ہوتی

خان صاحب:۔ہاں ہونا چاہیے۔خوب کہا ہے۔

امراو:تسلیم!مقطع ملاحظہ ہو۔

اے اداؔ ہم کبھی نہ مانیں گے
دل کو دل کی خبر نہیں ہوتی

خان صاحب:۔کیا مقطع کہا ہے۔یہ آپ اپنا تجر بہ بیان کرتی ہیں اور لوگوں کی رائے اس کے خلاف ہے۔

امراو:۔ذاتی تجر بہ جو کچھ ہو، میں نے ایک شاعرانہ مضمون کہا ہے

رسوؔا:۔اچھا ذرا پھر تو پڑھیے۔

امراو جان نے پھر پڑھا۔

رسوا:۔مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کے دونوں پہلو اس شعر میں نکل سکتے ہیں۔

خان صاحب:۔واقعی مرزا صاحب کیا بات کہی؟

احباب:غزل از مطلع تا مقطع ایک رنگ ہے

آغا صاحب:۔نشستِ الفاظ تو ملاحظہ ہو۔

پنڈت صاحب:۔کیا دُرفشانی کی ہے۔

امراو جان:(کھڑی ہو کے)تسلیم۔

منشی صاحب: ۔اب آپ کچھ ارشاد کیجئے۔

خان صاحب: ۔حضرت مجھے تو معاف کیجئے، کچھ یاد نہیں آتا۔

رسوا: ۔کچھ تو پڑھیے

خان صاحب نے ایک مطلع اور دو شعر پڑھے۔

خان صاحب:

حیف بنت[2] العنب نہیں ملتی

ماہ میں ایک شب نہیں ملتی

رسوا: ۔کیا اچھا کنایہ ہے یعنی شبِ چار دہم۔

خان صاحب: ۔تسلیم!

یوں تو ملتی ہے دادِ صنعتِ شعر
دادِ حسنِ طلب نہیں ملتی

رسوا: ۔لاجواب شعر ہے۔

خان صاحب: تسلیم!

شوخیوں سے کسی کی میری مراد
پہلے ملتی تھی اب نہیں ملتی

رسوا: ۔لاجواب شعر ہے۔

خان صاحب: ۔تسلیم!

اس کے بعد ایک صاحب تشریف لائے۔آدمی کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔

خان صاحب: ۔یہ کون صاحب آتے ہیں۔شب ماہ میں لالٹین کی کیا ضرورت تھی؟

نواب صاحب: ۔حضرت حماقت ہوئی ہو تو معاف کیجئے گا۔

خان صاحب: ۔آخاہ! نواب صاحب! بحضور مضائقہ ندارد[1]

نواب صاحب تشریف لائے۔سب نے تعظیم کی۔غزل پڑھنے کی فرمائش ہوئی۔

IqbalCyberLibrary.net All rights reserved. ©2002-2006

نواب صاحب :۔ میں تو آپ صاحبوں کا مشتاق ہو کے آیا ہوں۔ مجھے تو کچھ یاد نہیں۔

شیخ صاحب: جناب غزل پڑھنا ہو گی۔

نواب صاحب :۔ اچھا جو کچھ یاد آتا ہے عرض کیے دیتا ہوں۔

دل میں کھب جائے گی قاتل کی ادا ایک نہ ایک
کارگر ہوگا کبھی تیرِ قضا ایک نہ ایک

احباب :۔ واہ کیا شعر کہا ہے؟

نواب صاحب :۔ تسلیم! اس کے بعد چپ ہو رہے۔

رسوا :۔ اور کچھ ارشاد ہو۔

نواب صاحب :۔ واللہ اب کچھ یاد نہیں آتا۔

منشی صاحب :۔ اب آپ دادِ فصاحت دیجئے۔

نواب صاحب :۔ امتثالاً للامر[1]۔ دو تین شعر عرض کیے دیتا ہوں

وصل میں ذکرِ عدو بھی دم بہ دم ہوتا رہا
شربتِ دیدار میرے حق میں سم ہوتا رہا

احباب: تعریف۔

نواب صاحب:

زاہدا دو دن سے چرچا حق پرستی کا ہوا
ورنہ کعبہ میں سدا ذکرِ صنم ہوتا رہا

نواب صاحب :۔ ہم نہیں کہہ سکتے مگر خوب کہا۔

نواب صاحب :۔ کہیے یا نہ کہیے مگر بات سچی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔

واعظا کیوں سر جھکائے وہ کسی کے روبرو

جس کا سرِ نقشِ قدم پر اُس کے خم ہوتا رہا

احباب:۔تعریف۔

نواب صاحب:۔

زلف کی تعریف میں دفتر کے دفتر لکھ دیے

مو بمو حالِ پریشانی رقم ہوتا رہا

رسوؔا:۔یہ خاص لکھنؤ کا مذاق ہے۔

نواب صاحب:۔اور آپ دہلی کے کب ہیں؟

رسوؔا:۔اچھا، شعر پڑھیے، میں نے ایک بات کہی۔

نواب صاحب:۔

دل جو تھا پہلے گُلِ نورستۂ باغِ مراد

خار خارِ حسرتِ رنج و الم ہوتا رہا

نواب صاحب:۔دیکھیے کیا شعر کہا ہے؟

خاں صاحب:۔متانتِ الفاظ ملاحظہ ہو۔

نواب صاحب:۔تسلیم۔مقطع ملاحظہ ہو۔

شکر یہ مخمورؔ اُس کا کب ادا تجھ سے ہوا

ہر نفس تجھ پر جو خالق کا کرم ہوتا رہا

خاں صاحب:۔سبحان اللہ! ہر نفسے کہ فرو میرو و ممدِ حیات است و چوں می آید مفرح ذات[1]۔

رسوؔا:۔خاں صاحب آپ کے مارے تو شعر پڑھنا مشکل ہے۔

احباب: سبحان اللہ! کیا غزل فرمائی ہے۔

نواب صاحب:۔آپ کی عنایت، پرورش، بندہ نوازی۔واللہ یہ آپ ہی لوگوں کا صدقہ ہے۔

IqbalCyberLibrary
All rights reserved
©2002-2006

منشی صاحب: ۔شیخ صاحب! آپ تو کچھ ارشاد کیجئے۔

شیخ صاحب: ۔(مسکرا کر) جی مجھے تو کچھ یاد نہیں۔

خاں صاحب: ۔یاد نہیں مگر ستر شعر کی غزل جیب میں ہو گی۔

شیخ صاحب: ۔واللہ نہیں۔صرف چار شعر ابھی موزوں کر لیے ہیں۔

رسواؔ: ۔تو پھر پڑھتے کیوں نہیں؟

شیخ صاحب: ۔عرض کیے دیتا ہوں۔

عرض وہ عرض کہ جس بات سے انکارر نہ ہو
بات وہ بات کہ جس بات سے انکار نہ ہو

احباب: ۔تعریف۔

شیخ صاحب: ۔تسلیم۔

مثلِ یوسف سر بازار پڑے پھرتے ہو
کیا ہی شرماؤ اگر کوئی خریدار نہ ہو

رسواؔ: ۔کیا اچھا مذاق ہے

شیخ صاحب: ۔تسلیم!

دل وہ اچھا جو حسینوں کی نظر میں نہ جچے
جنس و خوب کوئی جس کا خریدار نہ ہو

خاں صاحب: ۔بہت خوب۔

شیخ صاحب: ۔تسلیم!

قتلِ عشاق کی بے کار قسم کھاتے ہو
ہم نہ مانیں گے اگر ہاتھ میں تلوار نہ ہو

اتنے میں ایک آدمی آیا اور اس نے ایک پرچہ منشی احمد حسین کو دیا۔

منشی صاحب: ۔(رقعہ پڑھ کر) لیجئے مرزا صاحب تشریف نہیں لائیں گے۔غزل

تازہ تصنیف بھیج دی ہے۔

میں نے آدمی سے پوچھا کیا کرتے ہیں؟

آدمی:۔ (مسکرا کر) جی حضور سکندر باغ میں سرشام بہت انگریزی درختوں کے ناندے لے کے آئے ہیں۔ ان کو گول حوض کے کنارے پتھروں کے اندر رج رہے ہیں، مالی پانی دیتا جاتا ہے۔

رسوا:۔ جی ہاں! انہیں اپنے اعمال سے فرصت کہاں جو مشاعرے میں تشریف لائیں۔

منشی صاحب:۔ اچھا تو غزل پڑھ دیجئے۔ واللہ کیا صحبت کو بے لطف کیا۔ نہ آئے نا! اچھا غزل ہی پڑھ دیجئے۔

رسوا:۔ مجھ سے کچھ نہ پڑھوایئے گا۔

منشی صاحب:۔ ہاں خوب یاد آیا۔ اچھا تو پہلے آپ پڑھ لیجئے۔

رسوا

نہ پوچھو ہم سے کیونکر زندگی کے دن گزرتے ہیں
کس بے درد کی فرقت میں جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
کوئی ان سے کہے دل لے کے بھی یوں ہی مکر جانا
عدو کے سامنے جو گالیاں دے کر مکرتے ہیں
ابھی تو ہنس رہے ہیں مدعی ذوقِ جراحت پر
نہ پوچھو اس مزے کو جب نمک زخموں میں بھرتے ہیں
تماشہ ہو جو ان کا بوسہ لے کر ہم مکر جائیں
بہت جو چاہنے والوں کا دل لے کر مکرتے ہیں
انہیں کا نام لے لے کر کوئی فرقت میں مرتا ہے

کبھی تو وہ بھی سن لیں گے جو بدنامی سے ڈرتے ہیں
بگاڑا ہم کو قسمت نے تو پھر بنا نہیں ممکن
وہ گیسو ہیں کسی کے جو بگڑ کے پھر سنورتے ہیں
کبھی شانے سے الجھے وہ کبھی آئینے کو توڑا
سنورنے میں بگڑتے ہیں بگڑنے میں سنورتے ہیں
ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گی ادائیں ان کے جوبن کی
دوپٹہ اوڑھ کر آڑا جو چلنے میں ابھرتے ہیں
ادا سے ناز کو رسوؔا ہے دعویٰ پارسائی کا
کوئی پوچھے تو آخر مرنے والے کس پہ مرتے ہیں

احباب نے ہر شعر کی داد دی۔ رسوؔا نے سرِ تسلیم خم کیا۔ اس کے بعد مرزا صاحب کی غزل پڑھنا شروع کی۔

کل رات کو انہیں جو کہیں دیر ہوگئی
دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہوگئی
مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہوگئی
بیہودہ خواہشوں نے نہ جینے دیا ہمیں
ان موذیوں سے عقل اگر زیر ہوگئی
اے موت تجھ کو کیا ہوا تو ہی بلا سے آ
ان کو تو آتے آتے بڑی دیر ہوگئی
میری تباہیوں کی تمہیں اب خبر ہوئی
کیا پوچھتے ہو عمر یونہی تیر ہوگئی

آج ان سے ہم نے آنے کا وعدہ لیا تو ہے
دم ہی نکل گیا جو کہیں دیر ہوگئی
ٹلنا تھا میرے پاس سے اے کاہلی تجھے
کمبخت تو تو آکے یہیں ڈھیر ہوگئی
دبکی ہوئی تھی گربہ صفت خواہشِ گناہ
چمکار نے سے پھول گئی شیر ہوگئی
مرزا مشاعرے میں نہ تشریف لائیں گے
تاچند انتظار بڑی دیر ہوگئی

اس کے بعد مظہر الحق نامی ایک شاعر کہیں باہر کے رہنے والے جو اس وقت اتفاق سے وارِدِ مشاعرہ تھے، انہوں نے یہ نظم پڑھی۔

ہے ہمارے مشاعروں کا یہ حال
جس کی اب نقل کرتے ہیں نقال
روشِ اہلِ فن پہ ہنستے ہیں
رنگِ بزمِ سخن پہ ہنستے ہیں
کیا زمانے میں غدر ہے توبہ
شاعری کی یہ قدر ہے توبہ
گو کہ پاسِ ادب نہیں کرتے
ہجو کچھ بے سبب نہیں کرتے
چلتے ہیں شاعرانِ خوش تقریر
اپنے ہمراہ لے کے جمِ غفیر
کب سخنور اکیلے جاتے ہیں
قدر دانوں کو لے کے آتے ہیں

Iqbal Cyber Library
All rights reserved
©2002-2006

جاتے ہیں معرکوں میں فوج سمیت
ساتھ ہوتے ہیں بیشمار پھندیت
جن کے ہمراہ یہ ہجوم نہ ہو
کبھی ان کے غزل کی دھوم نہ ہو
اک اُدھر واہ واہ کرتا ہے
اک اِدھر آہ آہ کرتا ہے
واہ کیا طرزِ دُرفشانی ہے
واہ کیا وضعِ خوش بیانی ہے
کوئی کہتا ہے واہ کیا کہنا
فی الحقیقت ہے یہ نیا کہنا
اس سے بہتر کہے گا کیا کوئی
کب ہے استاد آپ سا کوئی
اس زمانے میں آپ یکتا ہیں
واقعی فخرِ میر و مرزا ہیں
کب میسر تھا ان کو حسنِ کلام
کچھ نہ تھے وہ فقط ہے نام ہی نام
ان کے دیواں میں کب یہ نشتر ہیں
بخدا آپ اُن سے بہتر ہیں
ان سے واللہ آپ اچھے ہیں
ثم باللہ آپ اچھے ہیں
کہیں بڑھ کر ہے آپ کا انداز
نکتہ سنجی ہے یا کہ ہے اعجاز

Iqbal Cyber Library
All rights reserved.
©2002-2006

آپ قدرت نمائے معنی ہیں
فی الحقیقت خدائے معنی ہیں
آپ کے آگے کون منھ کھولے
کس کا مقدور ہے جو کچھ بولے
ہے یہ انداز آپ کا حصہ
ہے یہ اعجاز آپ کا حصہ
دل میں ہم خوب کر چکے ہیں غور
آپ ہی آپ ہیں نہیں کچھ اور
آپ ایسے ہیں ، آپ ویسے ہیں
ہم سمجھتے ہیں آپ جیسے ہیں
آپ کیا قدر اپنی پہچانیں
پوچھیے ہم سے، آپ کیا جانیں
آپ کا کام ہے ہوا بندی
آپ پر ختم ہے ادا بندی
ایسے شاعر ہوئے تھے کب پیدا
نہ ہوئے تھے نہ ہوں گے اب پیدا
الغرض بے تکی اڑاتے ہیں
بچھے جاتے ہیں لوٹے جاتے ہیں
ان کی تعریف ہے وہ لاطائل لے
جس سے دکھتا ہے دوسروں کا دل
منھ سے وہ شعر اُدھر نکالتے ہیں
یہ اِدھر ٹوپیاں اچھالتے ہیں

جن کے تعریف کا یہ تھا مذکور
اپنے دل میں بہت ہی ہیں مسرور
اگر اس میں کسی کو غصہ آئے
کچھ تعجب نہیں کہ لٹھ چل جائے
نہیں یہ بات کچھ تعجب کی
بلکہ اکثر ہوا ہے ایسا بھی
پڑھتے ہیں لفظ لفظ رک رک کے
ہو رہے ہیں سلام جھک جھک کے
گو بظاہر ہے انکسار بہت
دل میں ہے جوشِ افتخار بہت
کس قدر تنتے ہیں پھرتے ہیں
خود بھی تعریف اپنی کرتے ہیں
ہوتی ہے لفظ لفظ کی تشریح
ہوتی ہے بات بات کی تصریح
کیوں نہ ہوں اپنی مدح کے شائق
جانتے ہیں کہ ہم ہیں اس لائق
کس قدر دور ہیں معاذاللہ
کیسے مغرور ہیں معاذاللہ
نکتہ فہم ایسے نکتہ داں ایسے
شاعر ایسے ہیں قدرداں ایسے
جھوٹی تعریف کی حقیقت کیا
جب حقیقت نہ ہو تو لذت کیا

اس میں کیا حظ ہے یہ مزا کیا ہے
کوئی پوچھے انہیں ہوا کیا ہے
گو کہ میری مذمتیں ہوں گی
میں سمجھتا ہوں جو گتیں ہوں گی
صاف گوئی کی داد پاؤں گا
میں بھی اپنی مراد پاؤں گا
کیا غرض ہے یہ میں کسی سے ڈروں
بات سچی ہے کیوں نہ کہہ گزروں
مجھ کو بھاتی نہیں لگی لپٹی
بلکہ آتی نہیں لگی لپٹی
طرزِ اہلِ سخن سے ناخوش ہوں
روشِ اہل فن سے ناخوش ہوں
شاعری ہے اگر اس کا نام
دور سے ایسی شاعری کو سلام

اس نظم کی انصاف پسند احباب نے بڑی تعریف کی۔

رسوا:۔ ہر شعر پر اہلِ محفل تعریفیں کرتے جاتے تھے۔ منشی صاحب پر وجد کا عالم طاری تھا۔ امراؤ جان جھوم رہی تھیں۔ اور میرا جو حال تھا وہ میرے دل سے کوئی پوچھے۔

منشی صاحب:۔ ہاں جناب آغا صاحب اب آپ کچھ فرمائیے۔

آغا صاحب:۔ بہت خوب! مطلع اول ملاحظہ ہو۔

کہیں سامان ایسے ہوں تو کچھ دل کو مرے کل ہو
مٹرا بلے ہوئے ہوں اور اک ٹھرے کی بوتل ہو

احباب:۔ آغا صاحب کیا مطلع فرمایا ہے۔

آغا صاحب:۔اے حضرت ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے۔دوسرا مطلع سنیے۔

وہ مضموں ڈھونڈ کر باندھوں کہ جو اشکل اہو

کہوں وہ مطلعِ ثانی کہ جو اول سے اول ہو

احباب:۔بیشک اول سے اول ہے۔

آغا صاحب:۔اچھا اب شعر ملاحظہ ہوں۔

اس شعر کا رخ نواب صاحب کی طرف تھا جو جالی کا کرتا ہلکا بادامی رنگ کا اور باریک ململ کا انگرکھا پہنے بند کھولے ہوئے بیٹھے تھے اور ایک نہایت نفیس پنکھیا ہاتھ میں تھی اسے جھلتے جاتے تھے۔

اگر جاڑے میں تو مل جائے تو کیا غم ہے جاڑے کا

تری زلفیں ہوں شانے پر دوشالہ ہو نہ کمل ہو

احباب:تعریف۔

آغا صاحب:۔

کہو بے چارگی میں بھی طبیعت خوش رکھے مجنوں

کہ چرلے ناقۂ لیلیٰ ہری جب دل کی کونپل ہو

پنڈت جی:۔سبحان اللہ!اور لو اور۔یہ بے چارگی سے کیا چارہ نکالا ہے۔

احباب:۔واللہ سمجھے بھی خوب۔سمجھ ہو تو ایسی نہیں تو نہ ہو۔

آغا صاحب:۔نہ ہو۔اچھا اب یہ شعر سنیے۔

کہو عشاق سے اپنے کہ ضبطِ گریہ فرمائیں

رکے گا راستہ گھر کا اگر کوچے میں دلدل ہو

شیخ صاحب:۔اچھی کہی۔

رسوا:۔(خاں صاحب) آپ کیوں سکوت میں ہیں۔کوئی اعتراض نکالیے۔

آغا صاحب:۔ہاں جناب سکوتِ سخن شناس ٹھیک نہیں ہے۔

خاں صاحب:۔آپ میری تعریف کو تحسین ناشناس نہ سمجھیں اس لیے چپ ہوں۔

آغا صاحب:۔نہیں حضرت میری ایسی الٹی سمجھ نہیں ہے۔

احباب اس پر لوٹ گئے۔

آغا صاحب:۔شعر سنیئے۔

ہمیں رشک آئے اپنے سے ہمیں سے غیر ہو پیدا
ہم ایسے دو نظر آئیں اگر معشوق احول ہو

احباب:۔آغا صاحب:۔سبحان اللہ! کیا نازک خیالی ہے۔

آغا صاحب:۔

ابھی کم سن ہیں اس کو شوق ہے لنگر لڑانے کا
تکلا ڈور کا ہو، ایک کنکیا نہ تکل ہو

اس شعر کا رخ بھی نواب صاحب کی طرف تھا اس لیے کہ آپ ہی کی سرکارِ عالی جاہ سے کنکوے کی برات بڑی دھوم سے نکلی تھی۔

آغا صاحب:۔

کوئی ان سے کہے جو شعر معنی بند کہتے ہیں
کھلے کیا رازِ سر بستہ جو دروازہ مقفل ہو

رسوا:۔آغا صاحب کیا کہنا! امراو جان، ذرا سنا کیا شعر کہا ہے۔

امراو جان:۔سبحان اللہ! میں پہلے ہی سمجھ گئی۔جو چاہیں کہیں مالک ہیں۔

آغا صاحب:۔تو صاف کیوں نہیں کہتیں کہ دوزخ کا دربان ہوں۔اچھا سنیئے۔

کسی صورت سے بہلالیں گے اس معشوق کم سِن کو
ڈبل پیسہ نہ ہو ریوڑی نہ ہوتو گول گپل ہو

احباب:۔کیا کہنا۔

آغا صاحب:۔

کبھی گالی سنا بیٹھے کبھی جوتا لگا بیٹھے
حکومت کا مزہ آئے اگر معشوق ارزل[1] ہو

خاں صاحب:۔ درست مگر آپ کی شرافت سے بعید ہے۔

آغا صاحب:۔ جناب شریف کون ہے اس زمانے میں۔

خدا کے فضل سے اترا تھا کیا ہی عرش سے جوڑا
نہ مجھ سا کوئی گرگا[2] ہو، نہ تم سی کوئی شفتل[2] ہو

نواب صاحب:۔ خوب! مگر روئے سخن کس کی طرف ہے؟

آغا صاحب:۔ یہ تو آپ ہی خوب سمجھ سکتے ہیں اس لیے کہ آپ محرمِ راز ہیں۔

السر عند کرام النا مکتوم[3]۔

خاں صاحب:۔ آپ جواب دیجیے۔

آغا صاحب:۔ آپ کیا جواب دیں گے۔ یہ شعر سنیے۔

ہم اس نازک ادا کی شوخیوں پر جان دیتے ہیں
شتر کے جس میں غمزے ہوں فرس کی جس میں چھل بل ہو

احباب:۔ واہ ری ہمت۔

آغا صاحب:۔ اچھی نہ سہی۔ یہ سنیے۔

میں دل کو چیر ڈالوں گا جو تم پہلو سے اٹھ جاؤ
میں آنکھیں پھوڑ ڈالوں گا جو تم آنکھوں سے اوجھل ہو

احباب:۔ خوب۔

آغا صاحب:۔

تمھاری سادگی میں کچھ عجب عالم نکلتا ہے

نہ چوٹی ہو نہ کنگھی ہو، نہ مسّی ہو نہ کاجل ہو

امراؤ جان:۔ اوئی تو کیا دن رات سر جھاڑ منھ پہاڑ بیٹھا رہے۔

آغا صاحب:۔ سادگی کا یہ مزہ ہے اور دوسرے خرچ کی بھی کفایت ہے۔

اس مذاق میں لطف یہ ہے کہ امراؤ جان کسی قدر خسیس[۱] مشہور تھیں۔

ٹکا ہم سے وہ جب مانگیں انہیں چپکے سے ہم دے دیں
نہ بک بک ہو نہ جھک جھک ہو نہ کچ کچ ہو نہ کل کل ہو

احباب:۔ کیا مصرع کہا ہے!

خاں صاحب:۔ اوپر کا مصرع بھی خوب لگایا۔ وہی ارزل کی رعایت چلی آتی ہے۔

امراؤ جان:۔ ہنستے ہنستے لوٹی جاتی تھیں۔

آغا صاحب:۔ اچھا! اب ایسے شعر نہ پڑھیں، ہمارا معشوق ذلیل ہو جاتا ہے۔

نازک خیالی سنیے۔

تری نازک کمر کے باب میں چہلک بنا دیں گے
وہ کیا سمجھے یہ باریکی طبیعت جس کی گتھل[۲] ہو

خاں صاحب:۔ میں تسلیم کیے لیتا ہوں کہ میری طبیعت ایسی ہے جیسا آپ ارشاد فرماتے ہیں مگر برائے خدا اس چہلک کے معنی سمجھا دیجیے۔

آغا صاحب:۔ خیر خاطر ہے سن لیجیے۔ محاسب[۳] لوگ خانہ پری کے بجائے ندارد یہ نشان (x) بنا دیا کرتے ہیں۔ اس لیے اس سے یہ مطلب نکلا کہ کمر معدوم ہے، دوسرے ایک خط نے بیچوں بیچ سے دوسرے کا کاٹ دیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوا کہ معشوق کی کمر کٹی ہوئی ہے اور پھر جڑی ہوئی بھی ہے۔

خاں صاحب:۔ یہ کیونکر؟

آغا صاحب:۔ اب اس باریکی کو نہ پوچھیے۔ خیر حضرت واضح ہو کہ چہلک علم ریاضی میں علامت جمع کی ہے لطف یہ ہے کہ علامت کی کوئی مقدار نہیں ہوتی مطلب یہ نکلا

کہ کمر باوجود معدوم ہونے کے جسم کے دونوں حصوں کو جوڑے ہوئے ہے۔

احباب:۔حضرت۔بس نازک خیالی کی حد ہوگئی۔جو کوئی اتنے علم جانتا ہوں وہ آپ کے شعر سمجھے۔

آغا صاحب:۔اسی سے تو میں ایسے ویسوں کے سامنے پڑھتا نہیں۔افسوس استاد مرحوم زندہ نہ ہوئے تو ان شعروں کی کچھ داد ملتی۔اب سمجھنے والوں میں کون رہ گیا ہے خیر اب مقطع سن لیجیے۔طبیعت کل کلفت ہوگئی۔کوئی قدردان نہیں ہے۔

بس اے قزاق بس! طبع قیامت خیز کو روکو
غضب ہو جائے گا فوجِ مضامیں میں جو ہلچل ہو

احباب:۔مقطع پھر عنایت ہو۔آغا صاحب نے دوبارہ پڑھا۔

نواب صاحب:۔کیا زبردست تخلص رکھا ہے قزاق۔

آغا صاحب:۔معاف فرمائیے گا ہے تو کچھ ایسا ہی مگر کچھ نازیبا نہیں ہے۔ایک تو خاندانی اعتبار سے اس لیے کہ فدوی کے آباؤ اجداد دشتِ قبچاق میں لوٹ مار کیا کرتے تھے، دوسرے اس سبب سے کہ استاد مرحوم سارق تخلص فرماتے تھے۔اور کچھ ایسا نامناسب نہ تھا اس لیے کہ (ان کی روح شرمندہ نہ ہو) عمر بھر اگلے شاعروں کے مضمون چرا چرا کے شعر موزوں فرمایا کیے۔سارا دیوان ملاحظہ کر لیجیے۔شاید ہی کوئی شعر نیا ہو۔جب اشہب خامہ[1] کی لگام میرے دستِ اقتدار میں آئی تو میں نے سرقہ کو اپنی شان کے منافی سمجھ کے قزاق تخلص رکھ لیا۔کچھ نہ سہی اس میں ایک طرح کا بانکپن تو ہے۔بندہ کا یہ دستور رہا کہ شعرائے ماضی و حال کے مضامین زبردستی چھین چھین کے اپنے قبضہ میں کر لوں گا۔

نواب:۔بہت مبارک۔

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد فالسہ کی برف جمائی گئی۔اس کے دو دو قفلیاں احباب نے نوش کیں۔سب اپنے اپنے مکان تشریف لیے گئے۔اس کے بعد

دسترخوان بچھا۔منشی صاحب نے اور میں نے اور امراؤ جان نے کھانا کھایا۔

منشی صاحب:۔(امراؤ جان سے) ذرا اپنا وہ مقطع تو پڑھیے جو آپ نے پہلے پڑھا تھا۔

امراؤ جان:۔

کسی کو سنائیں حالِ دلِ زار اے اداؔ
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

منشی صاحب:۔اس میں شک نہیں کہ آپ کے حالات بہت ہی دلچسپ ہوں گے۔جب سے آپ نے مقطع پڑھا ہے، مجھے یہی خیال ہے۔اگر آپ اپنی سرگزشت بیان کریں تو لطف سے خالی نہ ہوگا۔

میں نے بھی منشی صاحب کے کلام کی تائید کی۔مگر امراؤ جان بچاتی تھیں۔

ہمارے منشی صاحب مہربان کو ابتدائے سن سے قصہ کہانیوں کا بڑا شوق تھا الف لیلہ، امیر حمزہ کی داستان کے علاوہ بوستانِ خیال کی کل جلدیں نظر سے گزری ہوئی تھی۔ کوئی ناول ایسا نہ تھا جو آپ نے نہ دیکھا ہو۔مگر لکھنؤ میں چند روز رہنے کے بعد جب اہل زبان کی اصلی بول چال کی خوبی کھلی، اکثر ناول نویسوں کے بے تکے قصے مصنوعی زبان اور تعصب آمیز بے ہودہ جوش دلانے والی تقریریں آپ کے دل سے اتر گئی تھیں۔لکھنؤ کے بامذاق لوگوں کی گفتگو بہت ہی پسند آئی تھی۔امراؤ جان کے اس مقطع نے آپ کے دل میں وہ خیال پیدا کیا جس کا اشارہ اوپر کیا گیا ہے۔القصہ منشی صاحب کے شوق اور میری اشتعالک[1] نے امراؤ جان کو مجبور کیا اور وہ اپنی سرگزشت کہنے پر مجبور ہوگئیں۔

اس میں کچھ شک نہیں امراؤ جان کی تقریر بہت شستہ تھی اور کیوں نہ ہو! اول تو خواندہ، دوسرے اعلیٰ درجہ کی رنڈیوں میں پرورش پائی۔شہزادوں اور نواب زادوں کی صحبت اٹھائی۔محلات شاہی تک رسائی۔جو کچھ انہوں نے آنکھوں سے دیکھا اور

لوگوں نے کانوں سے سنا ہوگا۔

اپنی سرگزشت وہ جس قدر کہتی جاتی تھیں میں ان سے چھپا کے لکھتا جاتا تھا تمام ہونے کے بعد میں نے مسودہ دکھایا۔ اس پر امراؤ جان بہت بگڑیں۔ مگر اب کیا ہوتا تھا۔ آخر کچھ سمجھ بوجھ کے چپ ہو رہیں۔ خود پڑھا اور جا بجا جو کچھ رہ گیا تھا اُسے درست کر دیا۔

میں امراؤ جان کو اس زمانے سے جانتا ہوں جب ان سے نواب صاحب سے ملاقات تھی۔ انہیں دنوں میری نشست بھی اکثر وہاں رہتی تھی۔ اس سرگزشت میں جو کچھ بیان ہوا ہے مجھے اس کے حرف بحرف صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے مگر یہ میری ذاتی رائے ہے۔ ناظرین کو اختیار ہے جو چاہیں قیاس کریں۔

مرزا رسوا

امراؤ جان ادا

لطف ہے کونسی کہانی میں
آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

سنئے مرزا رسوا صاحب۔ آپ مجھ سے کیا چھیڑ چھیڑ کے پوچھتے ہیں۔ مجھ کم نصیب کی سرگزشت میں ایسا کیا مزہ ہے جس کے آپ مشتاق ہیں۔ ایک نا شاد نا مراد، آوارہ وطن، خانماں برباد، ننگِ خاندان، عارِ دو جہاں کے حالات سن کے مجھے ہرگز امید نہیں کہ آپ خوش ہوں گے۔

اچھا سنیئے اور اچھی طرح سنیئے۔

باپ دادا کا نام لے کے اپنی سرخروئی جتانے سے فائدہ کیا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد بھی نہیں، ہاں اتنا جانتی ہوں کہ فیض آباد میں شہر کے کنارے کسی محلّہ میں میرا

گھر تھا۔ میرا مکان پختہ تھا۔ آس پاس کچھ کچے مکان کچھ جھونپڑے، کچھ کھپریلیں، رہنے والے بھی ایسے ہی ویسے لوگ ہوں گے۔ کچھ بھشتی، کچھ نائی، دھوبی، کہار میرے مکان کے سوا ایک اونچا گھر اس محلّہ میں اور بھی تھا۔ اس مکان کے مالک کا نام تھا نام دلاور خاں۔

میرے ابا بہو بیگم صاحبہ کے مقبرے پر نوکر تھے۔ معلوم نہیں کا ہے میں، نام کیا تھا، کیا تنخواہ تھی۔ اتنا یاد ہے کہ لوگ ان کو جمعدار کہتے تھے۔

دن بھر میں اپنے بھائی کو کھلایا کرتی تھی اور وہ بھی مجھ سے اس قدر ہلا ہو تھا کہ دم بھر کے لیے نہ چھوڑتا تھا۔

ابا جب شام کو نوکری پر سے آتے تھے اس وقت کی خوشی ہم بھائی بہنوں کی کچھ نہ پوچھیے۔ میں کمر سے لپٹ گئی، بھائی ابا ابا کہہ کے دوڑا دامن سے چمٹ گیا۔ ابا کی باچھیں مارے خوشی کے کھل جاتی ہیں۔ مجھ کو چمکارا پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ بھیا کو گود میں اٹھالیا پیار کرنے لگے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ کبھی خالی ہاتھ گھر نہ آتے تھے۔ کبھی دو کتارے لیے ہاتھ میں ہیں کبھی بتاشوں یا تل کی لڈوؤں کا دونا ہاتھ میں ہے۔ اب اس کے حصے لگائے جا رہے ہیں۔ اس وقت بھائی بہنوں میں کس مزے کی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ وہ کتارا چھیننے لیے جاتا ہے، میں مٹھائی کا دونا ہتھیائے لیتی ہوں۔ اماں سامنے کھپریل میں بیٹھی کھانا پکا رہی ہیں۔ ابا ادھر آ کے بیٹھے نہیں ادھر میرے تقاضے شروع ہو گئے۔ ابا اللہ گڑیاں نہیں لائے۔ دیکھو میرے پاوں کی جوتی کیسی ٹوٹ گئی ہے تم کو تو خیال ہی نہیں رہتا۔ لو ابھی تک میرا طوق سنار کے ہاں سے بن کر نہیں آیا۔ چھوٹی خالہ کی لڑکی کی دودھ بڑھائی ہے، بھئی میں کیا پہن کے جاؤں گی؟ چاہے کچھ ہو عید کے دن تو میں نیا جوڑا پہنوں گی، ہاں میں تو نیا پہنوں گی۔ جب اماں کھانا پکا چکیں، مجھے آواز دی۔ میں گئی، روٹی کی ٹوکری اور سالن کی پتیلی اٹھا لائی۔ دستر خوان بچھا، اماں نے کھانا نکالا، سب نے سر جوڑ کر کھانا کھایا۔ خدا کا شکر کیا، ابا نے عشاء کی

نماز پڑھی ،سورے ہے ،صبح کو تڑکے ابا اُٹھے ،نماز پڑھی ،اسی وقت میں کھڑک سے اٹھ بیٹھی پھر فرمائشیں شروع ہوئیں۔

''میرے ابا آج نہ بھولنا گڑیاں ضرور لیتے آنا۔ آبا شام کو بہت سارے امرود اور نارنگیاں لانا............''

ابا صبح کو نماز پڑھ کے وظیفہ پڑھتے ہوئے کوٹھے پر چڑھ جاتے تھے۔ کبوتروں کو کھول کے دانہ دیتے تھے۔ ایک دو ہوا میں اڑاتے تھے۔ اتنے میں ماں جھاڑو بہارو سے فراغت کر کے کھانا تیار کر لیتی تھیں کیونکہ ابا پھر دن چڑھنے سے پہلے ہی نوکری پر چلے جاتے تھے۔ امّاں سینا پرونا لے کے بیٹھ جاتی تھیں۔ میں بھیا کو لے کے کہیں محلّہ میں نکل گئی یا دروازے پر املی کا درخت تھا وہاں چلی گئی ہمجولی لڑکیاں لڑکے جمع ہوئے ،بھیّا کو بٹھا دیا خود کھیل میں مصروف ہوگئی۔ ہائے کیا دن تھے، کسی بات کی فکر نہ تھی۔ اچھے سے اچھا کھاتی تھی اور بہتر سے بہتر پہنتی تھی کیونکہ ہمجولی لڑکے لڑکیوں میں کوئی مجھ کو اپنے سے بہتر نظر نہ آتا تھا۔ دل کھلا ہوا نہ تھا، نگاہیں پھٹی ہوئی نہ تھیں۔ جہاں میں رہتی تھی وہاں کوئی مکان میرے مکان سے اونچا نہ تھا اور سب ایک کوٹھریا کھپریل میں رہتے تھے۔ میرے مکان میں آمنے سامنے دو دالان تھے صدر کے دالان کے آگے کھپریل پڑی ہوئی ،اِدھر اُدھر دو کوٹھریاں تھیں، سامنے دالان کے ایک باورچی خانہ تھا۔ دوسری طرف کوٹھے کا زینہ ،کوٹھے پر ایک کھپریل دو کوٹھریاں ،کھانے پکانے کے برتن ضرورت سے زیادہ تھے ،دو چار دریاں چاندنیاں بھی تھیں۔ ایسی چیزیں محلّہ کے لوگ ہمارے گھر مانگنے آتے تھے۔ ہمارے گھر میں بھشتی پانی بھرتا تھا۔ محلّہ کی عورتیں خود ہی کنوئیں میں سے پانی بھر لاتی تھیں۔ ہمارے ابّا جب گھر سے وردی پہن کے نکلتے تھے لوگ انہیں جھک جھک کر سلامیں کرتے تھے۔ میری امّاں ڈولی پر سوار ہو کے مہمان جاتی تھیں۔ ہمسائیاں پاؤں پیدل ماری ماری پھرتی تھیں۔

صورت شکل میں بھی میں اپنی ہمجولیوں سے اچھی تھی۔ اگر چہ درحقیقت خوبصورتوں میں میرا شمار نہیں ہوسکتا مگر ایسی بھی نہ تھی جیسی اب ہوں، کھلتی ہوئی چمپئی رنگت تھی ناک نقشہ بھی خیر کچھ ایسا برا نہ تھا۔ ماتھا کسی قدر اونچا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ بچپنے کے پھولے پھولے گال تھے۔ ناک اگر چہ ستواں نہ تھی مگر پچکی او ر پہیہ پھری بھی نہ تھی۔ ڈیل ڈول بھی سن کے موافق اچھا تھا اگر چہ اب ویسی نہیں رہی۔ نازکوں میں میرا شمار نہ جب تھا نہ اب ہے۔ اس قطع پر پاؤں میں لال گلبدن کا پائجامہ چھوٹے چھوٹے پاپچوں کا ٹول کا نیفہ، نینوں کی کرتی تنزیب کی اوڑھنی، ہاتھوں میں چاندی کی تین تین چوڑیاں، گلے میں طوق، ناک میں سونے کی نتھنی۔ اور سب لڑکیوں کی نتھنیاں چاندی کی تھیں، کان ابھی تازے تازے چھدے تھے، ان میں صرف نیلے ڈورے پڑے تھے۔ سونے کی بالیاں بننے کو گئی تھیں۔

میری شادی میری پھوپی کے لڑکے کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی، منگنی نو برس کے سن میں ہوگئی تھی، اب ادھر سے شادی کا تقاضہ تھا۔ میری پھوپی نواب گنج میں بیاہی ہوئی تھیں۔ پھوپا ہمارے زمیندار تھے۔ پھوپی کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ بھراپرا تھا۔ منگنی ہونے سے پہلے میں کئی مرتبہ اپنی اماں کے ساتھ وہاں جا چکی تھی۔۔ وہاں کے کارخانے ہی اور تھے۔ مکان تو کچا تھا مگر بہت وسیع۔ دروازے پر چھپر پڑے تھے۔ گائے بیل بھینسیں بندھتی تھیں۔ گھی دودھ کی افراط تھی۔ اناج کی کثرت، بھٹوں کی فصل میں ٹوکروں بھٹے چلے آتے ہیں۔ کتاروں کی پھاندیاں کی

پھاندیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اوکھ کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ کوئی کہاں تک کھائے۔

میں نے اپنے دولہا (یعنی جس کے ساتھ میری نسبت ٹھہری ہوئی تھی) کو بھی دیکھا تھا بلکہ ساتھ کھیلی تھی۔ ابا پورا جہیز کا سامان کر چکے تھے۔ کچھ روپے کی اور فکر تھی رجب کے مہینے میں شادی کا تقرر ہوگیا تھا۔

رات کو ابا اماں میں جب میری شادی کی باتیں ہوتی تھیں میں چپکے چپکے

سنا کرتی تھی۔ اور دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی۔ واہ میرے دولہا کی صورت کریمن (ایک دھنیے کی لڑکی کا نام تھا جو میرے ہمسن تھی) کے دولہا سے اچھی ہے۔ وہ تو کالا کالا ہے، میرا دولہا گورا گورا ہے۔ کریمن کے دولہا کے منھ پر کیا بڑی سی داڑھی ہے، میرے دولہا کے ابھی مونچھیں بھی اچھی طرح نہیں نکلیں۔ کریمن کا دولہا ایک میلی سی دھوتی باندھے رہتا ہے، ماشی رنگی ہوئی مرزئی پہنے رہتا ہے۔ میرا دولہا عید کے روز کس ٹھاٹھ سے آیا تھا۔ سبز چھینٹ کا دگلہ، گلبدن کا پائجامہ، مصالحہ کی ٹوپی، مخملی جوتا، کریمن کا دولہا سر میں ایک پھینٹا باندھے ہوئے ننگے پاوں پھرتا ہے۔

غرض کہ میں اپنی حالت میں خوش تھی اور کیوں نہ خوش ہوتی کیوں کہ اس سے بہتر اور کوئی حالت میرے خیال میں نہ آسکتی تھی۔ مجھے اپنے تمام آرزوئیں بہت ہی جلد پوری ہوتی معلوم ہوتی تھیں۔

مجھے یاد نہیں کہ جب تک میں اپنے باپ کے گھر میں رہی مجھے کوئی صدمہ پہنچا ہو۔ مگر ایک مرتبہ جب میری انگلی کا ایک چھلا چند۱ڈھیری کھیلنے میں جاتا رہا تھا، موا چاندی کا تھا، شاید ایک آنہ سے زیادہ کا نہ ہوگا۔ یہ اب کہتی ہوں، اس وقت اتنی تمیز کہاں تھی کہ قیمت کسی چیز کی مجھے معلوم ہی نہ تھی، اس چھلے کے لیے میں اتنی روئی کہ آنکھیں سوج گئیں۔ اماں سے دن بھر چھپایا آخر جب رات کو انہوں نے انگلی خالی دیکھی، مجھ سے حال پوچھا۔ اب کہنا ہی پڑا۔ اماں نے ایک تمانچہ میرے منھ پر مارا۔ میں چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ ہچکیاں بندھ گئیں۔ اتنے میں ابا آگئے۔ انہوں نے مجھے چمکارا، اماں پر خفا ہوئے اس وقت مجھے تسکین ہوئی۔

بے شک ابا مجھے اماں سے زیادہ چاہتے تھے۔۔ ابا نے کبھی پھول کی چھڑی نہیں چھوائی۔ اماں ذرا ذرا سی بات پر مار بیٹھتی تھیں۔ اماں چھوٹے بھیا کو بہت چاہتی تھیں۔ چھوٹے بھیا کے لیے میں نے بہت مار کھائی مگر پھر بھی مجھے اس سے انتہا

کی محبت تھی۔ امّاں کی ضد سے تو کبھی کبھی دو دو پہر میں نے گود میں نہیں لیا مگر جب ان کی آنکھ اوجھل ہوئی فوراً گلے سے لگالیا۔ گود میں اٹھالیا پیار کرلیا۔ جب دیکھا امّا آتی ہیں جلدی سے اتار دیا، اب وہ رونے لگا۔ اس پر اماں سمجھتی تھی کہ میں نے رلا دیا، لگیں گھڑکیاں دینے۔

یہ سب کچھ تھا مگر جہاں انگلی دکھی، اور اماں قرار ہوگئیں کھانے پینے کا ہوش نہیں، راتوں کو نیند حرام، کسی سے دوا پوچھتی ہیں کسی سے تعویذ منگاتی ہیں۔

میرے جہیز کے لیے اپنے ہاتھ گلے کا گہنا اتار کے ابا کے حوالے کیا۔ اس میں تھوڑی چاندی ملوا کے پھر بنوادو۔ وہ ایک عدد جو نئے بنے ہوئے ہے ان کو اجلوادو۔ گھر بھر کے برتنوں میں دو چار رکھ لیے باقی نکال کے الگ کردیے کہ ان پر قلعی کرادو۔ بلکہ ابّا نے کہا بھی کہ کچھ اپنے آیندہ کا بھی خیال رکھو۔ امّا نے کہا وہ جی ہوگا! تمہاری بہن زمیندار کی بیوی ہیں وہ بھی تو جانیں کہ بھائی نے لڑکی کو کچھ دیا۔ لاکھ تمہاری بہن ہیں سسرال کا نام برا ہوتا ہے۔ میری لڑکی ننگی بوچی جائے گی تو لوگ طعنے دیں گے۔

مرزا رسوا صاحب! میں نے اپنے ماں باپ کے گھر اور بچپن کی حالت کا پورا نقشہ آپ کے سامنے کھینچ دیا ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر میں اُس عالم میں رہتی تو خوش رہتی یا ناخوش، اسے آپ کو خود قیاس کرسکتے ہیں۔ میری ناقص عقل میں یہ آتا ہے کہ میں اس حالت میں اچھی رہتی۔

ابتدا آوارگی کی جوشِ وحشت کا سبب
ہم تو سمجھے ہیں مگر ناصح کو سمجھائیں گے کیا

میں نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ جو ذات کی رنڈیاں ہیں ان کا تو ذکر ہی

کیا، جو کچھ نہ کریں کم ہے کیونکہ وہ ایسے گھر اور ایسی حالت میں پرورش پاتی ہیں جہاں سوائے بدکاری کے اور کسی چیز کا مذکور ہی نہیں، ماں بہن جس کو دیکھتی ہیں اسی حالت میں ہیں اگر یہ ماں، باپ کی بیٹیاں جو اپنے گھروں سے نکل کے خراب ہو جاتی ہیں ان کو وہاں مارے جہاں پانی نہ ملے۔

میرا حال جتنا میں بیان کر چکی ہوں اتنا ہی کہہ کے چھوڑ دوں اور اس کے بعد یہ کہہ دوں کہ بس اس کے بعد میں آوارہ ہوگئی۔ اسی سے یہ خیال پیدا ہوگیا کہ کمبخت اودھ لٹاتی تھی۔ شادی ہونے میں دیر ہوئی۔ کسی سے آنکھ لگا کے نکل آئی، اس نے چھوڑ دیا، کسی اور سے آشنائی کی، اس سے بھی نہ بنی، آخر رفتہ رفتہ یہی پیشہ ہوگیا۔ واقعی اکثر ایسا ہوتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سی بہو بیٹیوں کو خراب ہوتے دیکھا اور سنا۔ اس کے سبب بھی کئی ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جوان ہوگئیں، ماں باپ شادی نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ شادی اپنی پسند سے نہیں ہوتی، ماں باپ نے جہاں پایا وہیں جھونک میاں کے سن کا لحاظ کیا نہ صورت شکل دیکھی، نہ مزاج کا حال دریافت کیا، میاں سے نہ بنی نکل کھڑی ہوئیں اور جوانی میں سر پر آسمان ٹوٹا، رانڈ ہوگئیں۔ صبر نہ ہو سکا دوسرا کر لیا یا بدصحبت ملی آوارہ ہوگئیں۔ مگر مجھ بدنصیب ناشدنی کو بخت و اتفاق نے مجبور کر کے ایسے جنگل میں چھوڑا جہاں سوائے گمراہی کے کوئی راستہ ہی نہ تھا۔

دلاور خاں جس کا مکان ہمارے مکان سے تھوڑی دور پر تھا مواڈ کیتوں سے ملا ہوا تھا۔ لکھنؤ میں برسوں قید رہا۔ اسی زمانے میں نہیں معلوم کس کی سفارش سے چھوٹ آیا تھا۔ ابا سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جب فیض آباد سے گرفتار ہوا تو محلّہ سے اس کے چال چلن کی تحقیقات کے لیے لوگ طلب ہوئے ان میں ابا بھی تھے۔ آہ بچارے یوں بھی دل کے سادے اور زبان کے سچے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ رانی لٹوالے صاحب نے ان کے ہاتھ میں قرآن دے کے پوچھا ''ول جمعدار تم

سچ کہے یہ کیسا آدمی ہے؟'' ابا نے صاف صاف جو اس کا حال تھا کہہ دیا۔ انہیں کی گواہی پر دلاور خاں قید ہو گیا۔ یہ حال میں نے اپنی ماں سے سنا تھا۔ وہی کینہ اس کے دل چلا آتا تھا۔ اب کی جب قید سے چھوٹ کر آیا تو اس نے ابا کی ضد پر کبوتر پالے۔ ایک دن اس نے ابا کا کبوتر مارا۔ لینے کو گئے نہ دیا۔ آبا چار آنے دیتے تھے وہ آٹھ آنے مانگتا تھا۔ ابا تو نوکری پر چلے گئے جھٹ پٹے وقت خدا جانے میں کیوں نکلی تھی۔ دیکھتی کیا ہوں کہ املی کے نیچے کھڑا ہوا ہے، کہنے لگا چلو بیٹا تمہارے ابا پیسے دینے گئے تھے کبوتر لے لو۔ میں اس کے دم میں آ گئی ساتھ چلی گئی۔ جا کے جو دیکھتی ہوں گھر میں کانی چڑیا نہیں، اکیلا مکان پڑا ہے۔ ادھر میں گھر میں داخل ہوئی ادھر اس نے اندر سے کنڈی بند کر لی۔ چاہتی ہوں کہ چیخوں اس نے منہ سے گودڑ ٹھونس دیا۔ میرے دونوں ہاتھ رومال سے کس دیئے۔ اس مکان کا ایک دروازہ دوسری طرف تھا مجھے زمین پر بٹھا کے آپ گیا وہ دروازہ کھولا اور پیر بخش کہہ کے آواز دی۔ پیر بخش اندر آیا۔ دونوں نے مل کر مجھے بیل گاڑی پر سوار کر کیا کہ بیل گاڑی چل نکلی۔ میں دم بخود رہ گئی۔ تلے کی سانس تلے اوپر کی اوپر۔ کروں کیا کوئی بس نہیں موذی کے چنگل میں ہوں۔ دلاور خاں بہلی کے اندر مجھ کو گھٹنوں کے نیچے دباؤ ہوئے بیٹھا ہے۔ ہاتھ میں چھری ہے۔ موے کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے، پیر بخش گاڑی ہانک رہا ہے۔ بیل ہیں کہ اڑے چلے جا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں شام ہو گئی۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ جاڑے کے دن تھے، سناٹے کی ہوا چل رہی تھی۔ سردی کے مارے میں بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ دم نکلا جاتا تھا۔ آنکھوں سے باران جاری تھی۔ دل میں یہ خیال آتا ہے کہ ہائے کس آفت میں پھنسی۔ ابا نوکری پر سے آئے ہوں گے، مجھے ڈھونڈتے ہوں گے۔ اماں پیٹ رہی ہوں گی۔۔ چھوٹا بھائی کھیل رہا ہو گا۔ اسے کیا معلوم بہن کس آفت میں ہے۔ ماں باپ، بھائی مکان کا دالان انگنائی باورچی خانہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہ سب خیالات

ایک طرف تھے اور جان کا خوف ایک طرف۔ دلاور خاں گھڑی گھڑی چھری دکھاتا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی دم میں یہ چھری میرے کلیجے کے پار ہوگی۔ گو وڑاب میرے منھ میں نہ تھا ادھر تو میرا یہ حال تھا ادھر دلاور خاں اور پیر بخش میں ہنس ہنس کر باتیں ہو رہی تھیں۔ میرے ماں باپ پر اور مجھ پر بات بات میں گالیاں پڑتی جاتی تھیں۔

دلاور خاں:۔ دیکھا بھائی پیر بخش! سپاہی کے پوت بارہ برس کے بعد اپنا بدلہ لیتے ہیں اب کیسا..........تلملاتا پھرتا ہوگا۔

پیر بخش:۔ بھئی تم نے بے شک اس مثل کو اصل کر دکھایا۔ بار برس تو ہوئے ہوں گے تمھیں قید ہوئے۔

دلاور خاں:۔ پورے بارہ برس ہوئے، بھائی لکھنؤ میں کیا کیا مصیبتیں اٹھائی ہیں خیر..........وہ بھی تو کوئی دن یاد کرے گا۔ یہ تو میرا پہلا وار تھا۔ میں تو اس کو جان سے ماروں گا۔

پیر بخش:۔ کیا یہ بھی ارادہ ہے؟

دلاور خاں:۔ تم سمجھتے کیا ہو، جان سے نہ مارا ہو تو پٹھان کا تخم نہیں۔

پیر بخش:۔ بھئی تم بھی قول کے سچے ہو جو کہو گے کر دکھاؤ گے۔ اور اسے کیا کرو گے؟

دلاور خاں:۔ کریں گے کیا یہیں کہیں مار کے نالے میں توپ دو۔ راتوں رات گھر چلے چلو۔

یہ بات سن کر مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو تھم گئے۔ دل میں آپ دھچکا لگا۔ منکا ڈھل گیا۔ ہاتھ پاؤں ڈال دیے۔ یہ حال دیکھ کے بھی موئے کٹر کو ترس نہ آیا اور ایک گھونسہ زور سے میرے کلیجے پر مارا کہ میں بلبلا گئی۔ قریب تھا کہ گر پڑوں۔

پیر بخش:۔ اسے تو مار ڈالو گے اور ہمارا روپیہ؟

دلاور خاں: ۔گلے گلے پانی[1]۔

پیر بخش: ۔کہاں سے دوگے ہم تو کچھ اور ہی سمجھتے تھے۔

دلاور حسین: گھر چلو۔کہیں سے نہ ہو سکے تو کبوتر بیچ کے دے دوں گا۔

پیر بخش: ۔اماں لکھنؤ میں چل کر اسی چھوکری کے کوڑے[2] کرلو۔

جب سے اپنے مرنے کا یقین ہو گیا تھا مجھے اب دونوں کی باتیں کانوں سے اچھی طرح سنائی نہ دیتی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی خواب میں باتیں کر رہا ہے۔

پیر بخش کی بات سن کر میرے دل میں کو بھر اپنی زندگی کا کچھ آسرا بندھا۔دل ہی میں پیر بخش کو دعائیں دینے گی۔مگر اب یہ انتظار ہے کہ دیکھوں یہ موذی کیا کہتا ہے۔

دلاور خاں: ۔اچھا دیکھا جائے گا ابھی چلے چلو۔

پیر بخش: ۔یہاں ذرا ٹھہر نہ جائیں۔وہ سامنے درخت کے نیچے آگ جل رہی ہے۔ تھوڑی آگ لے آئیں تو حقہ بھریں۔

پیر بخش تو آگ لینے گیا مجھے یہ خوف پیدا ہو کہ کہیں پیر بخش کے آتے آتے یہ میرا کام نہ تمام کردے۔جان کا خوف بڑا ہوتا ہے۔اکبارگی زور سے چیخ ماری۔ چیخ کا مارنا تھا کہ دلاور خاں نے دو تین تمانچے میرے منھ پر کس کس کے لگائے۔ حرامزادی چپ نہیں رہتی، ابھی چھری بھونک دوں گا.......... فیل[1] کرتی ہے..........

پیر بخش: ۔(ابھی تھوڑی ہی دور گیا ہوگا) نہیں بھئی نہیں، ایسا کام نہ کرنا، تمھیں ہمارے سر کی قسم اماں ہمیں تو آ لینے دو۔

دلاور خاں، اچھا جاؤ آگ تو لے آؤ۔

پیر بخش گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آگ لے کے آیا۔ حقہ بھرا۔ دلاور خاں کو دیا۔

دلاور خاں:۔ (ایک کش حقہ کا پی کے) تو یہ کتنے تک بِک جائے گی؟ اور بیچے گا کون؟ ایسا نہ ہو کہیں پکڑے جائیں تو اور مشکل ہو۔

پیر بخش:۔ اس کا ہمارا ذمہ ہم تو بیچ دیں گے۔ ارے میاں تمہاری باتیں۔ پکڑے گا کون لکھنؤ میں ایسے معاملے دن رات ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے سالے کو جانتے ہو؟

دلاور خاں:۔ کریم؟

پیر بخش: ہاں! اس کی روٹی اسی پر ہے، بیسیوں لڑکے لڑکیاں پکڑ لے گیا۔ لکھنؤ میں جا کے دام کھرے کر لیے۔

دلاور خاں:۔ آج کل کہاں ہے؟

پیر بخش:۔ کہاں ہے؟ لکھنؤ میں گومتی اُس پار اس کی سسرال ہے، وہیں ہوگا۔

دلاور خاں:۔ بھلا لڑکا لڑکی کتنے کو بکتے ہیں؟

پیر بخش:۔ جیسی صورت ہوئی۔

دلاور خاں:۔ بھلا یہ کتنے کو بک جائے گی؟

پیر بخش:۔ سو ڈیڑھ سو جیسی تمہاری تقدیر ہوئی۔

دلاور خاں:۔ بھائی کی باتیں۔ سو ڈیڑھ سو۔ اس کی صورت ہی کیا ہے ۱۰۰ سو بھی تو بہت ہے

پیر بخش:۔ اچھا اس سے کیا۔ لے تو چلو مار ڈالنے سے کیا فائدہ

اس کے بعد دلاور خاں نے پیر بخش کے کان میں کچھ جھک کر کہا جس کو میں نے نہیں سنا، پیر بخش نے جواب دیا وہ تو ہم سمجھتے ہی تھے تم بے وقوف ہو۔

رات بھر گاڑی چلا کی۔ میری جان سانسے میں تھی موت آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی، طاقت سلب ہوگئی تھی۔ بدن سن ہو گیا تھا۔ آپ نے سنا ہوگا نیند سولی

پر بھی آتی ہے۔ تھوڑی دیر میں میں آنکھ لگ گئی۔ ترس خدا کر کے پیر بخش نے بیلوں کا کمل اڑھا دیا۔ رات کو کئی مرتبہ چونک چونک پڑی۔ آنکھ کھل جاتی تھی مگر ڈر کے مارے چپکی پڑی تھی۔ آخر ایک مرتبہ ڈرتے ڈرتے منھ پر سے کمل سرکا کے جو دیکھا معلوم ہوا میں گاڑی میں اکیلی ہوں۔ پردے سے جھانک کے دیکھا سامنے کچھ کچے کچے مکان ہیں، ایک بنیے کی دکان ہے، دلاور خاں، اور پیر بخش کچھ خرید رہے ہیں، بیل سامنے برگد کے درخت کے نیچے بھوسہ کھا رہے ہیں، دو تین گنوار الاو کے پاس بیٹھے ہوئے تاپ رہے ہیں، ایک چلم پی رہا ہے اتنی دیر میں پیر بخش نے گاڑی کے پاس آ کے تھوڑی سے بھنے ہوئے چنے دیئے۔ میں رات بھر کی بھوکی تھی کھانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لوٹا پانی لا کے دیا۔ میں نے تھوڑا سا پیا۔ پھر چپکی ہو کے پڑ رہی۔

بڑی دیر تک گاڑی یہاں رکی رہی پھر پیر بخش نے بیل جوتے۔ دلاور خاں حقہ بھر کے میرے پاس آ بیٹھا۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ آج دن کو مجھ پر زیادہ سختی نہیں ہوئی نہ دلاور خاں کی چھری نکلی نہ مجھ پر گھونسے پڑے نہ گھڑکیاں۔۔ دلاور خاں اور پیر بخش دونوں جگہ جگہ پر حقہ بھر بھر کے پیتے تھے باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ جب باتیں کرتے کرتے تھک گئے کچھ گانے لگے۔ ایک گاتا ہے دوسرا چپکا سن رہا ہے۔ سن کیا رہا ہے سوچ رہا ہے کہ اب کیا بات نکالوں۔ پھر کوئی بات نکل آئی۔ اس گفتگو میں اکثر ایسا بھی ہوا کہ آپس میں گالی گلوج ہونے لگی۔ آستینیں چڑھ گئیں۔ کمریں کسی جانے لگیں، ایک گاڑی پر سے کود پڑتا ہے دوسرا وہیں گلا گھوٹنے کو تیار ہے۔ پھر کسی بات پر دونوں پڑ ڈھیلے پڑ گئے۔ بات رفت گزشت، پھر ملاپ ہوا، دوستی کی باتیں ہونے لگیں گویا کبھی لڑے ہی نہ تھے۔

ایک:۔ ہمارے تمہارے درمیان لڑائی کی کیا بات تھی؟

دوسرا:۔ بات ہی کیا تھی؟

پہلا:۔اچھا تو پھر اس بات کو جانے دو۔

دوسرا:۔جانے دو۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
اقبال اکادمی پاکستان
©2002-2006

دے پھڑکنے کی اجازت صیّاد

شبِ اوّل ہے گرفتاری کی

گرفتاری کی شبِ اول کا حال تو آپ سن چکے۔ ہائے وہ بے بسی مرتے دم تک نہ بھولوں گی۔ مجھے خود حیرت ہے کہ میں کیوں کر زندہ بچی ہے ہے کہ کیا سخت جان تھی کہ دم نہ نکلا۔ دلاور خاں بندے! دنیا میں تو خیر اپنی سزا کو پہنچا مگر کیا اس سے میرے دل کو تسکین ہوئی۔ موے کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کر چیل کووں کو کھلاتی تو بھی مجھے آہ نہ آتی۔ یقین ہے کہ قبر میں تجھ پر صبح و شام جہنم کے کندے پڑتے ہوں گے اور قیامت کے دن خدا چاہے تو اس سے بدتر درجہ ہوگا۔

ہائے میرے ماں باپ کا کیا حال ہوا ہوگا۔ کیسے تیری جان کو کلپتے ہوں گے۔

بس مرزا صاحب! اتنی آج کہی باقی کل کہوں گی۔ اب میرا دل ہے کہ امڈا چلا آتا ہے جی چاہتا ہے خوب چیخیں مار مار کر روؤں............

آپ میرے آوارگی کی سرگزشت سن کر کیا کیجئے گا۔ بہتر ہے کہ یہیں تک رہنے دیجیے۔ میں تو یہ کہتی ہوں کاش دلاور خاں مجھ کو مار ہی ڈالتا تو اچھا تھا۔ مٹی بھر خاک سے میری آبرو ڈھک جاتی۔ میرے ماں باپ کی عزت کو دھبا نہ لگتا دین و دنیا کی روسیاہی تو نہ ہوتی۔

ہاں میں نے اپنی ماں کو ایک بار پھر دیکھا تھا۔ کب ان کو دیکھا تھا؟ اس کو ایک زمانہ ہوا۔ اب خدا جانے جیتی ہیں یا مر گئیں۔ سنا ہے کہ چھوٹے بھائی کے ایک لڑکا ہے ماشاءاللہ! چودہ پندرہ برس کا۔ دو لڑکیاں ہیں۔ میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ان سب کو دیکھوں۔ کچھ ایسا دور بھی نہیں۔ موے ایک روپے میں تو آدمی فیض آباد پہنچ سکتا ہے مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ اس زمانے میں جب ریل نہ تھی فیض آباد سے لکھنؤ چار دن کا رستہ تھا۔ مگر دلاور خاں اس خوف سے کہیں میرا باپ پیچھا نہ کرے

نہیں معلوم کن بیہڑ راستوں سے لایا کوئی آٹھ دن میں لکھنو پہنچی، مجھ نگوڑی کو کیا خبر تھی کہ لکھنؤ کہاں ہے۔ مگر دلاور خاں اور پیر بخش کی باتوں سے میں اتنا سمجھ گئی تھی کہ یہ لوگ مجھے وہیں لیے جاتے ہیں۔ لکھنؤ کا میں نام گھر میں سنا کرتی تھی کیوں کہ میرے نانا یہیں کسی محل کی ڈیوڑھی پر سپاہیوں میں نوکر تھے۔ گھر میں ان کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ فیض آباد بھی گئے تھے۔ میرے لیے بہت سی مٹھائی اور کھلونے لے گئے تھے۔ میں انہیں اچھی طرح پہچانتی تھی۔

لکھنؤ میں گومتی اس پار کریم کی سسرال میں مجھے لا کر اُتارا، چھوٹا سا کچا مکان۔ کریم کی ساس موئی مردے لشونی سی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے گھر میں لے گئی

ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ صبح ہوتے لکھنؤ پہنچی تھی۔ دوپہر تک بند رہی پھر کوٹھری کا دروازہ کھلا ایک جوان سی عورت (کریم کی جورو) تین چپاتیاں اور ایک مٹی کے پیالے میں میں چمچہ بھر ماش کی دال اور ایک بدھنی پانی کی میرے آگے رکھ کے چلی گئی۔ مجھے اس وقت وہ نعمت ہوگئی۔ آٹھ دن ہو گئے تھے گھر کا پکا کھانا نصیب نہ ہوا تھا۔ راستے میں چنے اور ستوؤں کے سوا کچھ ملا ہی نہ تھا۔ کوئی آدھی بدھنی بھر پانی پی گئی۔ اس کے بعد زمین پر پاؤں پھیلا کے سو رہی۔ خدا جانے کتنی دیر سوئی کیونکہ اس اندھیرے کوٹھری میں دن رات کی تمیز نہ ہو سکتی تھی۔ اس مرتبہ درمیان میں کئی مرتبہ آنکھ کھلی۔ چاروں طرف اندھیرا، کوئی آس نہ پاس پھر اوڑھنی سے منہ ڈھانپ کے پڑ رہی پھر نیند آ گئی۔ تیسری۔ چوتھی مرتبہ جو آنکھ کھلی تو پھر نیند نہ آئی پڑی جاگتی رہی۔ اتنے میں کریم کی ساس ڈائن کی شکل بکتی بڑبڑاتی اندر آئی۔ میں اٹھ بیٹھی۔

لونڈیا کتنی سوتی ہے رات کو چیختے چیختے گلا پڑ گیا، جھنجوڑ جھنجوڑ کے اٹھایا۔ سانس ہی نہ لی میں تو سمجھی سانپ سونگھ گیا اے لو وہ تو اٹھ بیٹھی۔ میں چپکے سنا کی جب خوب بک چکی تو پوچھنے لگی۔

پیالہ کہاں ہے۔ میں نے اٹھا دیا وہ باہر لے کر نکلی۔ کوٹھری کا دروازہ بند

ہو گیا۔تھوڑی دیر کے بعد کریم کی جورو آئی۔اسی کوٹھری میں ایک کھڑکی لگی تھی۔اسے کھول دیا مجھ کو باہر نکالا۔ایک ٹوٹا سا کھنڈر پڑا تھا یہاں آکے آسمان دیکھنا نصیب ہوا۔تھوڑی دیر کے بعد پھر اسی کال کوٹھری میں بند کر دی گئی۔آج ارہر کی دال اور جوار کا دلیہ کھانے کو ملا۔

اسی طرح دو دن گذرے تیسرے دن ایک اور لڑکی مجھ سے سن میں دو ایک برس بڑی اسی کوٹھری میں لاکے بند کی گئی۔کریم خدا جانے کہاں سے پھسلا کے لے آیا تھا۔بچاری کیسی چھکو پھکو روتی تھی۔مجھ کو اس کا آنا غنیمت ہو گیا۔جب وہ رو دھو چکی تو چپکے چپکے باتیں ہوا کیں۔

کسی بنیے کی لڑکی تھی۔رام دئی نام تھا۔سیتاپور کے پاس کوئی گاؤں تھا وہاں کی رہنے والی تھی۔اندھیرے میں تو اس کی شکل دکھائی نہ دی جب حسب معمول دوسرے دن کھڑکی کھولی گئی تو اس نے مجھ کو دیکھا میں نے اسے دیکھا۔گوری گوری تھی بہت خوبصورت ناک نقشہ،ڈیل ذرا چھریرا تھا۔

چوتھے دن اس کال کوٹھری سے اس کی رہائی ہوئی میں وہیں رہی پھر تنہائی نصیب ہوئی۔دوپہر دن اکیلی وہیں رہی۔تیسرے دن رات کے وقت دلاور خاں اور پیر بخش نے مجھے آکے نکالا اپنے ساتھ لے چلے۔چاندنی رات تھی۔پہلے ایک میدان پھر ایک بازار میں سے ہو کر گزری۔پھر ایک پل پر آئے،دریا لہریں مار رہا تھا۔ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی میں کانپی جاتی تھی۔تھوڑی دور کے بعد پھر ایک بازار ملا۔اس سے نکل کے ایک تنگ گلی میں دور تک چلنا پڑا پاؤں تھک گئے اس کے بعد ایک اور بازار میں آئے یہاں بہت بھیڑیں تھیں۔راستہ مشکل سے ملتا تھا۔اب ایک مکان کے دروازے پر پہنچی۔

مرزا رسوا صاحب! آپ سمجھے یہ کون سا بازار تھا یہ وہ بازار تھا جہاں میری عزت فروشی کی دکان تھی یعنی چوک اور یہ مکان وہ تھا جہاں سے ذلت،عزت،

بدنامی، نیک نامی، زردروئی، سرخ روئی، جو کچھ دنیا میں ملنا تھا ملا یعنی خانم جان کے مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ تھوڑی دور پر زینہ تھا۔ زینہ پر سے چڑھ کے اوپر گئی۔

مکان کے صحن میں ہو کے صدر دالان کے داہنی طرف دالان وسیع میں خانم جان کے پاس گئی۔

خانم صاحب کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس زمانے میں اس کا سن قریب پچاس برس کے تھا کیا شاندار بڑھیا تھی۔ رنگ تو سانولا تھا مگر ایسی بھاری بھرکم جامہ زیب عورت دیکھی نہ سنی۔ بالوں کے آگے کی لٹیں بالکل سفید تھیں ان کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ ململ کا دوپٹہ سفید کیسا باریک چنا ہوا کہ شاید و باید اودے مشروع کا پائجامہ بڑے بڑے پائنچے، ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے کلائیوں میں پھنسے ہوئے کانوں میں سادی دو انتیاں لاکھ لاکھ بناؤ دیتی تھیں۔ بسم اللہ کی رنگت ناک نقشہ ہو بہو انہیں کا سا تھا مگر وہ نمک کہاں، اس دن کی صورت خانم کی مجھے آج تک یاد ہے پلنگڑی سی لگی ہوئی قالین پر بیٹھی ہیں۔

کنول روشن ہے، بڑا سا نقشی پاندان آگے کھلا ہوا رکھا ہیچوان پی رہی ہیں۔ سامنے ایک سانولی سی لڑکی (بسم اللہ جان) ناچ رہی ہے ہمارے جانے کے بعد ناچ موقوف ہوا، سب لوگ کمرے سے چلے گئے۔ معاملہ تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔

خانم جان:۔ یہی چھوکری ہے؟

دلاور خان: جی ہاں۔

مجھے پاس بلایا چمکار کے بٹھایا، ماتھا اٹھا کے صورت دیکھی۔

خانم جان:۔ اچھا! پھر جو ہم نے کہہ دیا ہے وہ موجود ہے اور وہ دوسری چھوکری کیا ہوئی؟

پیر بخش:۔ اس کا معاملہ ہو گیا۔

خانم: کتنے پر؟

پیر بخش: سو پر۔

خانم :۔اچھا۔خیر کہاں ہوا؟

پیر بخش: ۔ایک بیگم صاحبہ نے اپنے صاحبزادے کے واسطے مول لیا ہے۔

خاجم: ۔صورت شکل کی اچھی ہے ۔اس قدر رہم بھی دے نکلتے ۔مگر تم نے جلدی کی۔

پیر بخش: میں کیا کروں۔میں نے تو بہت سمجھایا میرے سالے نے نہ مانا۔

دلاور خان: ۔صورت تو اس کی بھی اچھی ہے آگے آپ کی پسند۔

خانم :۔خیر آدمی کا بچہ ہے۔

دلاور خاں: ۔اچھا جو کچھ ہے آپ کے سامنے حاضر ہے

خانم :اچھا۔تمہاری ہی ضد سہی ، یہ کہہ کر حسینی کو آواز دی۔

حسینی گدلی سی سانولی، ادھیڑ عورت سامنے آ کھڑی ہوئی

خانم :۔حسینی

حسینی :۔خانم صاحب۔

خانم :۔صندوقچہ لاؤ۔

حسینی گئی صندوقچہ لے آئی۔ خانم صاحب نے صندوقچہ کھولا۔ بہت سے روپے دلاور خاں کے سامنے رکھ دیے۔بعد ازاں معلوم ہوا کہ سوا سو روپے تھے۔

ان میں سے کچھ روپے پیر بخش نے گن کے اپنے رومال میں باندھے (سنا ہے کہ پچاس روپے) باقی دلاور خاں مردے نے اپنے ڈاب میں رکھے۔دونوں سلام کر کے رخصت ہوئے اب کمرے میں خانم صاحب ہیں اور بوا حسینی اور میں ہوں۔

خانم صاحب: (حسینی سے) حسینی یہ چھوکری اتنے داموں کی کچھ مہنگی تو نہیں معلوم ہوتی۔

حسینی: مہنگی۔میں کہتی ہوں سستی ہے۔

خانم :۔ سستی بھی نہیں ہے ۔ خیر ہوگا۔ صورت تو بھولی بھولی ہے۔ خدا جانے کس کی لڑکی ہے ہائے ماں باپ کا کیا حال ہوگا۔ خدا جانے کہاں سے موئے پکڑ لاتے ہیں ذرا بھی خوفِ خدا نہیں۔ بوا حسینی، ہم لوگ بالکل بے قصور ہیں۔ عذاب ثواب انہیں موؤں کی گردن پر ہوتا ہے ہم سے کیا۔ آخر یہاں نہ بکتی کہیں اور بکتی۔

حسینی :۔ خانم صاحب! یہاں پر اچھی رہے گی۔ آپ نے سنا نہیں۔ بیویوں میں لونڈیوں کی کیا گتیں ہوتی ہیں۔

خانم :۔ سنا کیوں نہیں۔ اے ابھی اس دن کا ذکر ہے سنا تھا سلطان جہاں بیگم نے اپنی لونڈی کو کہیں میاں سے بات کرتے دیکھ لیا تھا سیخوں سے داغ کر مار ڈالا۔

حسینی : دنیا میں جو چاہیں کر لیں قیامت کے دن ایسی بیویوں کا منھ کالا ہوگا۔

خانم :۔ منہ کالا ہوگا۔ جہنم کے کندے پڑیں گے۔

حسینی :۔ خوب ہوگا، موئیوں کی یہی سزا ہے

اس کے بعد بوا حسینی نے بڑی منت سے کہا۔

بیوی یہ چھوکری تو مجھے دید دیجیے میں پالوں گی ۔ مال آپ کا ہے خدمت میں کروں گی۔

خانم :۔ تمہیں پالو۔

اب تک بوا حسینی کھڑی ہوئی تھیں۔ اس گفتگو کے بعد میرے پاس بیٹھ گئیں۔ مجھ سے باتیں کرنے لگیں۔

حسینی :۔ بچی تو کہاں سے آئی ہے؟

میں : (رو کے) بنگلے سے۔

حسینی : (خانم سے) بنگلہ کہاں ہے؟

خانم : اے ہے کیا ننھی ہو؟ فیض آباد کو بنگلہ بھی کہتے ہیں۔

حسینی:۔(مجھ سے) تمہارے ابا کا کیا نام ہے؟۔

میں:۔جمعدار۔

خانم:۔تم بھی غضب کرتی ہو، بھلا وہ نام کیا جانے ابھی بچہ ہے۔

حسینی:۔اچھا تمہارا نام کیا ہے؟

میں:۔امیرن۔

خانم:۔بھئی یہ نام تو ہمیں پسند نہیں ہم تو امراو کہہ کے پکاریں گے۔

حسینی: سنا بچی! امراو کے نام پر تم بولنا۔جب بیوی کہیں گی امراو تم کہنا جی۔

اس دن سے امراو میرا نام ہو گیا۔تھوڑے دنوں کے بعد جب میں رنڈیوں کے شمار میں آئی لوگ امراو جان کہنے لگے۔

خانم صاحب مرتے دم تک امراو کہا کیں۔بوا حسینی امراو جان کہتی تھیں۔

اس کے بعد بوا حسینی مجھے اپنی کوٹھری میں لے گئیں۔اچھا اچھا کھانا کھلایا۔مٹھائیاں کھلائیں۔منہ ہاتھ دھلایا اپنے پاس سلا رکھا۔

آج رات کو میں نے ماں باپ کو خواب میں دیکھا۔جیسے ابا نوکری سے پر سے آئے ہیں مٹھائی کا دونا ہاتھ میں ہے۔چھوٹا بھائی سامنے کھیل رہا ہے اس کو مٹھائی کی ڈلیاں نکال کے دیں۔مجھے پوچھ رہے ہیں جیسے میں دوسرے دالان میں ہوں۔اماں باورچی خانے میں ہیں، اتنے میں ابا کو جو دیکھا، دوڑ کے لپٹ گئی رو رو کے اپنا حال کہہ رہی ہوں۔

خواب میں اتنا روئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔بوا حسینی نے ہوشیار کیا آنکھ جو کھلی کیا دیکھتی ہوں نہ وہ گھر ہے نہ دالان، ابا ہیں نہ اماں ہیں۔بوا حسینی کی گود میں پڑی رو رہی ہوں۔بوا حسینی آنسو پونچھ رہی ہیں۔چراغ روشن تھا۔میں نے دیکھا کہ بوا حسینی کے آنسو بھی برابر جاری ہیں۔

واقعی بوا حسینی بڑی نیک ذات عورت تھی۔اس نے مجھ پر وہ شفقت کی کہ چند

ہی روز میں اپنے ماں باپ کو بھول گئی اور بھولتی نہ تو کرتی کیا۔ اول تو مجبوری دوسری نئے ڈھنگ نئے رنگ۔ اچھے سے اچھے کھانے کو کھانے وہ جن کے ذائقے سے بھی آگاہ نہ تھی۔ کپڑے وہ جو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ تین لڑکیاں بسم اللہ جان، خورشید جان، امیر جان، ساتھ کے کھیلنے کو دن رات ناچ گانا جلسے۔ تماشے، میلے، باغوں کی سیر۔ وہ کون سا ایسا عیش کا سامان تھا جو مہیا نہ تھا۔

مرزا صاحب آپ کہیں گے کہ میں بڑے کٹر دل کی تھی کہ بہت جلد اپنے ماں باپ کو بھول کر کھیل کود میں پڑ گئی۔ اگر چہ میر اسن بہت کم تھا مگر خانم کے مکان میں آنے کے ساتھ ہی میرے دل کو آگاہی سی ہو گئی کہ اب مجھے عمر بھر یہیں تیر[1] کرنا ہے۔ جیسے نئی دلہن اپنی سسرال جا کے سمجھ لیتی ہے کہ میں یہاں ایک دو دن کے لیے نہیں بلکہ مرنے اور بھرنے کے لیے آئی ہوں، ٹھیک وہی میرا حال تھا۔ راستے میں موئے ڈکیتوں کے ہاتھ سے وہ ایذا اٹھائی تھی کہ خانم کا مکان میرے لیے بہشت تھا۔ ماں باپ کے ملنے کو میں بالکل ناممکن سمجھ چکی تھی اور چیز ناممکن سمجھ لی جاتی ہے اس کی آرزو باقی نہیں رہتی اگر چہ فیض آباد لکھنؤ سے صرف ۴۰ کوس ہے مگر اس زمانے میں مجھے بے انتہا دور معلوم ہوتا تھا۔ بچپن کی سمجھ میں اور اب میں بڑا فرق معلوم ہوتا ہے۔

☆

اک حال میں انسا ں کی بسر ہو نہیں سکتی
اب رنگ طبیعت کا بدل جاے تو اچھا

مرزا رسوا صاحب! خانم کا مکان تو آپ کو یاد ہوگا؛ کس قدر وسیع تھا، کتنے کمرے تھے، ان سب میں رنڈیاں (خانم کی نوچیاں) رہتی تھیں۔ بسم اللہ (خانم کی لڑکی) خورشید میری ہم سنیں تھیں۔ ان کی ابھی رنڈیوں میں گنتی نہ تھی۔ ان کے علاوہ دس گیارہ ایسی تھیں جو الگ الگ کمروں میں رہتی تھیں۔ ہر ایک کا عملہ جدا تھا۔ ہر ایک کا دربار علیحدہ ہوتا تھا۔ ایک سے ایک خوبصورت تھی۔ سب گہنے پاتے سے آراستہ، ہر وقت بنی ٹھنی تو لواں[1] جوڑے پہنے سادے سادے کپڑے جو ہم لوگ روز مرہ پہنے رہتے ہیں وہ اور رنڈیوں کو عید بقر عید میں نہیں نصیب ہوتے۔ خانم کا مکان تھا کہ ایک پرستان تھا۔ جس کمرے میں جھانکو سوائے ہنسی مذاق گانے بجانے کے کوئی چرچا نہ تھا۔ اگر چہ میں کم سن تھی مگر پھر بھی عورت ذات بڑی ہوشیار ہوتی ہے اپنے مطلب کی سمجھتی تھی۔ بسم اللہ خورشید کو گاتے ناچتے دیکھ کر میرے دل میں خود بخود ایک امنگ سی پیدا ہوئی۔ بجائے خود گنگنانے اور تھرکنے لگی۔ اسی عرصہ میں میری بھی تعلیم شروع ہوگئی۔ میری طبیعت فن موسیقی سے بہت ہی مناسب پائی گئی۔ آواز بھی پکے گانے کے لائق تھی۔ سرگم صاف ہونے کے بعد استاد نے آستائی[1] شروع کرادی۔

استاد جی بہت ہی اصول سے تعلیم دیتے تھے۔ ہر ایک راگ کا سر بیورہ[2] زبانی یاد کرایا جاتا تھا اور وہی گلے سے نکلواتے تھے۔ مجال نہ تھی کوئی سر کومل سے ات

[3]کومل، سدھ[4] سے اُسدھ یا تیور سے تیورتر ہو جائے اور میری بھی حجتیں کرنے کی عادت تھی۔ پہلے تو استاد جی (خدا کرے ان کی روح شرمندہ نہ ہو) ٹال دیا کرتے تھے۔

ایک دن خانم صاحب کے سامنے میں رام کلی گا رہی تھی۔ دھیوت[5] سدھ لگا گئی، استاد جی نے نہ ٹوکا۔ خانم صاحب نے پھر اسی کو کہوایا۔ میں نے پھر اسی طرح کہا۔ استاد جی پھر خبردار نہ ہوئے۔ خان صاحب نے گھور کے دیکھا۔ میں استاد جی کا منہ دیکھنے لگی۔ انہوں نے سر جھکا لیا۔ پھر تو خانم نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا۔

خانم:۔ استاد جی یہ کیا تھا۔ رام کلی میں او[6] چار دھیوت سے ہے اور وہی سرٹھیک نہیں۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں دھیوت کومل ہے یا سدھ۔

استاد:۔ کومل

خانم:۔ او چھوکری تو نے کیا کہا تھا۔

استاد:۔ سدھ۔

خانم:۔ پھر آپ نے ٹوکا کیوں نہیں؟

استاد:۔ مجھے خیال نہیں رہا۔

خانم:۔ وہ خیال کیوں نہیں رہا۔ اسی لیے میں نے دوبارہ کہلوایا۔ پھر بھی آپ منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھے رہے۔ آپ اسی طرح چھوکریوں کو تعلیم دیتے ہیں ابھی کسی سمجھ دار کے سامنے اسی طرح گاتی تو کیا وہ میرے جنم میں تھوکتا۔

استاد جی اس وقت تو بہت ہی خفیف ہوئے۔ چپ ہو رہے مگر دل میں بات لیے رہے۔ استاد جی اپنے کو نا ٹک[7] سمجھتے تھے۔ اور تھے بھی ایسے ہی۔ اس دن سے خانم کو ٹوکنا ان کو بہت ہی ناگوار ہوا۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میں سوہا[8] گا رہی ہوں۔ خانم بھی موجود ہیں میں

نے استاد جی سے پوچھا، گندھار کے اس میں کومل ہے یا ات کومل؟

استاد: ات کومل۔

خانم: ۔خاں صاحب ماشاء اللہ یہ میرے سامنے؟

استاد: ۔کیوں؟

خانم: ۔اور پھر آپ مجھی سے پوچھتے ہیں کیوں۔ سوہا میں گندھار اَت کومل ہے؟ بھلا آپ تو کہیے۔

استاد: ۔کہنے لگے گندھار میں کومل لگا گئے۔

خانم: ۔بس آپ ہی قائل ہوجیے۔ خود آپ کومل کہیں اور چھوکری کو بہکاتے ہیں یا مجھے کہتے ہیں؟ خاں صاحب میں کچھ عطائی نہیں۔ خاک چاٹ کے کہتی ہوں گلے سے نہ ادا ہو مگر ان کانوں نے کیا نہیں سنا۔ میں بھی ایسے ویسے گھرانے کی شاگرد نہیں ہوں۔ میاں غلام رسول کو آپ جانتے ہوں گے۔ ان باتوں سے کیا فائدہ اگر بتانا ہے تو دل سے بتایئے نہیں تو معاف کیجیے میں اور کوئی بندوبست کرلوں گی۔ چھوکریوں کو غارت نہ کیجیے۔

استاد جی: ۔بہت خوب!

یہ کہہ کے اٹھے گئے۔ کئی دن نہیں آئے خانم خود تعلیم دینے لگیں۔ چند دنوں کے بعد خلیفہ جی بیچ میں پڑے۔ قسما قسمی ہو کے ملاپ ہوگیا۔ اس دن سے استاد جی ٹھیک بتانے لگے۔ بتاتے نہ تو کرتے کیا۔ وہ خانم کو اتنا نہ سمجھتے تھے۔ عمر بھر حیرت رہی مجھے کہ خانم زیادہ جانتی ہیں یا استاد جی۔ کیونکہ بہت سی باتیں جو خانم سے معلوم ہوئیں استاد جی ان کو نہ بتا سکتے تھے۔ یا جان بوجھ کے بتاتے نہ تھے۔ لاکھ قسما قسمی ہو چکی تھی مگر پھر بھی یہ لوگ گر کی باتیں نہیں بتاتے، مجھے کچھ ایسا شوق ہوگیا تھا کہ جہاں کسی بات میں شک ہوا یا میں سمجھتی کہ استاد جی ٹالتے ہیں، استاد جی کے جانے کے بعد خانم صاحب سے پوچھ لیتی تھی۔ وہ بھی میرے اس شوق سے بہت ہی خوش ہوتی

تھیں۔بسم اللہ کو لعنتیاں دیا کرتی تھی۔بسم اللہ پر بہت محنت ہوئی مگر ٹپہ ،ٹھمری کے سوا کچھ نہ آیا۔خورشید کی آواز اچھی نہ تھی۔صورت پری کی اور گلا ایسا جیسے پھٹا بانس۔ ہاں ناچنے میں اچھی تھی اور یہی اس نے سیکھا بھی تھا۔ان کا مجرا صرف ناچ کا ہوتا تھا۔یوں گانے کو ایک آدھ چیز سیدھی سادی گا بھی دیتی تھی کہ گانے کا نام ہو جائے۔

خان کونوچیوں میں بیگا جان گانے میں فرد تھیں مگر صورت وہ کہ رات کو دیکھو تو ڈر جاؤ۔سیاہ جیسے اُلٹا تو ،اس پر چیچک کے داغ ،پاو بھر قیمہ بھر دو تو سما جائے ،لال لال آنکھیں ،بھدّی ناک بیچ میں سے پچکی ہوئی ،موٹے موٹے ہونٹھ ،بڑے بڑے دانت ،فربہ انتہا سے زیادہ ،اس پر ٹھنگنا قد ،بونی ،ہتھنی کی لوگ پھبتی کستے تھے۔مگر قیامت کا گلا تھا ،معلومات بہت اچھی تھی۔مورلے چھنا انہیں کے گلے سے نکلتے سنا۔

میں جب ان کے کمرے میں جا نکلتی مارے فرمائشوں کے دق کر دیتی تھی۔

میں :۔باجی !ہاں ذرا سرگم تو کہنا۔

بیگا:سنو۔سَ۔رِ گم پ دھ نی۔

میں :۔یہ میں نہیں مانتی ۔سرتیاں الگ الگ کرکے بتاؤ۔

بیگا :۔لڑکی تو تو بہت ستاتی ہے ،اپنے استاد جی سے نہیں پوچھتی۔

میں :۔اللہ باجی تمہیں بتا دو۔

بیگا:سَ۔رِ۔گ ۔مَ ۔پَ ۔دَھ نی دیکھ بائیس ہوئیں۔

۲۳۴۴۲۳۴

میں :۔(شرارت سے)اوئی میں نے نہیں گنیں۔پھر کہو۔

بیگا :۔جا۔اب نہیں کہتی۔

میں :۔واہ۔میں تو کہوا کے چھوڑوں گی۔

میں :۔ہاں ،اب کی گنیں۔نکھاد لے میں دو ہیں نا۔

بیگا:ہاں دو۔

میں :۔ تو ٹھیک بائیس ہیں ۔ اچھا لے اب تینوں گرام کہدو۔

بیگا:۔ لے اب ٹہلیے ۔ کل آیئے گا۔

میں :۔ اچھا طنبورہ اٹھالاؤں کچھ گاؤ۔

بیگا:۔ کیا گاؤں؟

میں : دھناسری۔

بیگا:۔ کیا گاؤں ۔ آستائی دھر[۲]پد ترانہ؟

میں :۔ اللہ باجی! دھرپد گاؤ۔

بیگا:۔ لے سن۔

تن کی تپ تب ہی مٹے جب پیا کو درشٹ[۳] بھر دیکھوں گی

جب درشن پاؤں گی ان کو تب ہی جی جنم اپنا لیکھوں گی

اشٹ[۴] جام دھیان موہے واکو رہت ہے نہ جانو کب درشن

تھیلوں[۵] گی

جو کو ہو پربھو پیارے سے ملادے وا کے پائن[۶] میں سیس[۷]

ٹیکوں گی

خانم جان کی نوچیوں کو صرف ناچ گانے کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی بلکہ لکھنے پڑھنے کے لیے مکتب بھی تھا۔ مولوی صاحب نوکر تھے۔ حسب دستور میں بھی مکتب میں بھیجی گئی۔ مولوی صاحب کا نورانی چہرہ سفید کترواں داڑھی ۔ صوفیانہ لباس، ہاتھ میں عمدہ فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں۔ خاکِ[۸] پاک کی تسبیح اُس میں سجدہ گاہ

بندھی ہوئی، ہرولی ۹ جریب، چاندی کی شام ۱ نہایت نفیس۔ڈیڑھ خمہ حقہ۔افیون کی ڈبیہ پیالی۔غرض کہ جملہ تبرکات آج تک نظر میں ہیں۔کیا ستھرا مذاق تھا۔وضعدار بھی ایسے کہ کسی زمانے میں بوا حسینی سے حسب اتفاق کچھ رسم ہو گیا تھا آج تک اس نباہے جارہے تھے۔بوا حسینی بھی انہیں دین و دنیا کا شوہر سمجھتی تھیں۔بڑھیا بڈھے میں اس مزے کی باتیں ہوتی تھیں کہ جوانوں کو حوصلہ ہوتا تھا۔مکان کہیں زید پور کی طرف تھا۔گھر پر خدا کے دیے گاؤں گراؤں، مکان، بیوی، جوان لڑکے لڑکیاں سب کچھ موجود تھی مگر خود جب لکھنؤ میں تحصیلِ علم کے لیے تشریف لائے یہیں رہے۔ شاید دو چار مرتبہ گئے ہوں گے۔اکثر عزیز ملنے کو یہیں چلے آتے تھے۔گھر سے کبھی کبھی کچھ آیا بھی کرتا تھا۔دس روپیہ خانم صاحب دیتی تھی۔یہ سب بوا حسینی کو ملتا تھا۔ کھانے نے پینے، حقہ، افیون کی تاک لے بوا حسینی لیتی تھیں۔تحویلدار بوا حسینی تھیں۔ کپڑا بوا حسینی بنوا دیتی تھیں۔خانم صاحب بھی مولوی صاحب کو بہت مانتی تھی۔بلکہ مولوی صاحب کی وجہ سے بوا حسینی کی عزت کرتی تھیں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ میری پرورش بوا حسینی نے اپنے ذمہ لی تھی۔اس لیے مجھ پر مولوی صاحب کی توجہ خاص تھی۔یہ تو میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی کہ مجھے کیا سمجھتے تھے۔پاسِ ادب مانع ہے اور لڑکیوں سے زیادہ مجھ پر تاکید تھی۔مجھ ایسی کندہ ناتراش کو انہوں نے آدمی بنایا۔یہ انہیں کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ جس امیر و رئیس کی محفل میں گئی حیثیت سے زیادہ میری عزت ہوئی۔انہیں کی بدولت آپ ایسے لائق و فائق صاحبوں کے جلسے میں منھ کھولنے کی جرأت ہوئی۔شاہی درباروں میں شرکت کا فخر حاصل ہوا۔اعلیٰ درجہ کی بیگمات کے محل میں گذر رہا۔

مولوی صاحب نے بہت ہی شفقت سے مجھے پڑھایا تھا۔الف بے ختم ہونے کے بعد کریما، مامقیما، محمود نامہ صرف روان پڑھا کے آمدنامہ یاد کرا دیا۔اس کے بعد گلستاں شروع کرا دی۔دو سطریں پڑھاتے تھے سبق حفظ کرا دیا جاتا تھا۔

خصوصاً اشعار لفظ لفظ کے معنی فقرے کی ترکیب نوک زبان تھی۔ لکھنے پڑھنے پر بھی محنت لی۔ املا درست کرایا گیا۔ خط لکھوائے گئے۔ گلستاں کے بعد اور کتابیں فارسی کی پانی ہو گئیں تھیں۔ سبق اس طرح ہوتا تھا جیسے آموختہ پڑھایا جاتا ہے۔ عربی کی صرف و نحو اور دو ایک رسالے منطق کے پڑھے۔ ساتھ آٹھ برس مولوی صاحب کے پاس پڑھتی رہی۔ شاعری کے شوق کی ابتداء اور انتہا سے آپ خود واقف ہیں اس کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں۔

ہم نہیں ان میں جو پڑھ لیتے ہیں توتے کی طرح
مکتبِ عشق و وفا تجربہ آموز بھی تھا

مکتب میں مجھ سمیت تین لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا تھا گوہر مرزا۔ حد کا شریر اور بدذات، سب لڑکیوں کو چھیڑا کرتا تھا۔ کسی کو منھ چڑھا دیا کسی کی چٹکی لے لی۔ کسی کی چوٹی پکڑ کے کھینچ لی۔ اس کے کان دُکھا دیے۔ دو لڑکیوں کی چوٹی ایک میں جکڑ دی کہیں قلم کی نوک توڑ ڈالی۔ کہیں کتاب پر دوات الٹ دی۔ غرض کہ اس کے مارے ناک میں دم تھا۔ لڑکیاں بھی خوب دھپیاتی تھیں اور مولوی صاحب بھی قرار واقعی سزا دیتے تھے مگر اپنی آنی بانی سے نہ چوکتا تھا۔ سب سے بڑھ کے میری گت بناتا تھا کیونکہ میں سب سے انیلی[1] اور گیگلی سی تھی اور مولوی صاحب کے دباو میں بھی رہتی تھی۔ میں نے مولوی صاحب سے کہہ کہہ کے مار پٹوائی۔ مگر بے غیرت کسی طرح باز نہ آیا۔ آخر میں بھی چغلیاں کھاتے کھاتے عاجز آ گئی۔ میری فریاد پر مولوی صاحب اس کو بہت ہی بے دردی سے سزا دیتے تھے کہ خود مجھے ترس آجاتا تھا۔ گوہر مرزا کے اس مکتب میں آنے کا سبب بھی بوا حسینی تھیں۔

نواب سلطان علی خاں ایک بڑے عالی خاندان رئیس تھے۔ توپ دروازہ میں رہتے تھے۔ ان سے اور بنو ڈومنی سے رسم تھا۔ انہیں سے یہ لڑکا پیدا ہوا۔ اگرچہ بنو سے اور نواب صاحب سے اب ترکِ ملاقات ہوئے مدت گزر گئی تھی۔ مگر دس

روپے ماہوار لڑکے کے پرورش کے دیے جاتے تھے اور بیگم صاحب سے چوری چھپے کبھی کبھی بلا کے دیکھ بھی لیا کرتے تھے۔ بنو قاضی کے باغ کی رہنے والی تھیں۔ وہیں بوا حسینی کے بھائی کا گھر تھا۔ کھڑکی درمیان میں تھی۔ گوہر مرزا بچپنے ہی سے ذاتِ شریف تھے۔ تمام محلّہ کا ناک میں دم تھا۔ کسی کے گھر میں ڈھیلا پھینک دیا کسی لڑکے سے چڑکوؤں کا پنجرا دیکھنے کو مانگا، اس نے دے دیا۔ آپ نے کھڑکی کی تیلی کھول دی سب چڑکوے پھر سے اڑ گئے۔ غرض کہ طرح طرح کے آزار دیتے تھے۔ آخر ماں نے عاجز آ کر محلّہ کی مسجد میں ایک مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا۔ یہاں بھی آپ نے ہتکھنڈے نہ چھوڑے۔ تمام ہم مکتب لڑکوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس کے کرتے میں مینڈک چھوڑ دیا۔ اس کی ٹوپی پھاڑ ڈالی۔ ایک لڑکے کی جوتی اٹھا کے کنویں میں ڈال دی۔ ایک دن مولوی صاحب نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت نے ان کا نیا چڑھواں جوتا حوض میں پیرا دیا خود بیٹھے ہوئے سیر دیکھ رہیں ہے اتنے میں کہیں مولوی صاحب سر پر پہنچ گئے۔ اب تو گوہر مرزا کی خوب مرمت ہوئی۔ مولوی صاحب نے مارے تمانچوں کے منھ لال کر دیا اور کان سے پکڑے ہوئے بنو کے گھر پر لے آئے۔ دروازے پر سے پکار کر کہا ’’لو صاحب اپنا لڑکا ہم اسے نہ پڑھائیں گے‘‘ یہ کہہ کے مولوی صاحب تو ادھر گئے، گوہر مرزا مظلوم صورت بنائے ہوئے روتا ہوا گھر میں آیا۔ اس وقت اتفاق سے بوا حسینی بنو سے بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔ لڑکے کا جو یہ حال دیکھا آپ کو بہت ہی ترس آیا۔ لڑکے کے کرتوتوں سے تو آگاہ نہیں مولوی صاحب کو برا بھلا کہنے لگیں۔

بوا حسینی:۔ اے ہے مولوی کا ہے کو مواقسائی ہے لڑکے کا منہ مارے تمانچوں کے سُجا دیا۔ اے لو کان بھی لہولہان کر دیے۔ اے بی بی ایسے مولوی سے کوئی نوج پڑھوائے، آخر ہمارے مولوی صاحب بھی تو پڑھاتے ہیں۔ کیسا چمکار کے دلار سے پڑھاتے ہیں۔ بنو نے چھوٹتے ہی کہا پھر بوا حسینی اس کو بلا سے اپنے مولوی صاحب

ہی کے پاس لے جاؤ۔

بوا حسینی: ۔لے تو جاؤں گی مگر دور بہت ہے ۔

بنو: ۔تمہارے بھائی کے ساتھ صبح کو بھجوا دیا کروں گی شام کو بلا لیا کروں گی ۔

بوا حسینی: ۔اچھا تو بھجوا دیا کرو۔

مولوی صاحب سے کچھ پوچھنا نہ تھا۔اس لیے بوا حسینی کو اپنی حسنِ خدمت پر پورا بھروسہ تھا۔جانتی تھیں کہ مولوی صاحب انکار تو کریں گے نہیں ۔

دوسر دن علی بخش (بوا حسینی کے بھائی کا نام تھا) گوہر مرزا کو ساتھ لے،مٹھائی کا خوان سر پر رکھے بوا حسینی کے پاس پہنچے۔بوا حسینی نے خوشی خوشی مٹھائی تقسیم کی۔ لڑکے کو مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا۔

گوہر مرزا سب سے زیادہ مجھی کو ستاتا تھا۔دن رات داد بیداد کا غل رہتا تھا۔ مولوی صاحب نے اس کو بہت مارا مگر اس نے مجھے ستانا نہ چھوڑا۔اسی طرح کئی برس گذر گئے۔آخر میرے اس کے درمیان صلح ہو گئی یا یوں کہئے کہ میں اس کے ستانے کی خوگر ہو گئی۔

گوہر مرزا کے اور میرے سن میں کچھ فرق ہو گا شاید وہ مجھ سے دو ایک سال بڑا ہو۔جس زمانے کا حال لکھ رہی ہوں ۔میرا سن کوئی تیرہ برس کا ہو گا اور گوہر مرزا کو چودھواں پندرھواں سال تھا۔

گوہر مرزا کے ستانے سے اب مجھ کو مزہ آنے لگا۔اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ڈومنی کا لڑکا تھا قدرتی لے دار لے بتانے میں مشاق بوٹی بوٹی پھڑکتی تھی۔ادھر میں لے سُر کی آگاہ۔جب مولوی صاحب مکتب میں نہ ہوتے تھے خوب جلسے ہوتے تھے۔کبھی میں گانے لگی وہ بتانے لگا۔کبھی وہ گا رہا ہے میں تال دے رہی ہوں۔ گوہر مرزا کی آواز پر اور رنڈیاں بھی فریفتہ تھیں ۔ہر ایک کمرے میں بلایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ میرا جانا بھی ایک ضروری بات تھی کیوں کہ بغیر میری اس کی سنگت کے

لطف نہ آتا تھا۔

سب سے زیادہ امیر جان اس کے گانے پر غش تھیں۔

مرزا صاحب! آپ کو تو امیر جان یاد ہوں گی؟

رسوا: یاد ہیں، کہے جاؤ۔

امیر جان کا وہ زمانہ جب مفتخر الدولہ بہادر کی ملازم تھیں۔ اللہ رے جوبن کے ٹھاٹھ وہ اٹھتی ہوئی جوانی

کھلتی کھلتی وہ چمپئی رنگت

بھولی بھولی وہ موہنی صورت

بانکی ناکی ادائیں ہوشربا

ترچھی ترچھی نگاہیں قہر خدا

بوٹا سا قد، چھریرا بدن، نازک نازک ہاتھ پاؤں۔

رسوا:۔ اب تو میں نے جب ان کو دیکھا تو انگلی پر ڈالنے کے لائق تھیں۔ ایسی بری صورت میں ہوگئی تھی کہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔

امراو:۔ کہاں دیکھا تھا؟

رسوا:۔ انہیں کے گھر میں دیکھا تھا جن کے کمرے کے سامنے شاہ صاحب گیروے کپڑے پہنے ہزار دانے کی تسبیح ہاتھ میں لیے کھڑے رہتے تھے۔ ادھر سے جو نکلتا تھا اس کو سلام کر لیتے تھے کبھی کسی سے سوال نہیں کرتے تھے۔

امراو:۔ سمجھ گئی۔ وہ شاہ صاحب ان کے عاشقوں میں تھے۔

رسوا:۔ جی ہاں! کیا میں نہیں جانتا۔

امراو:۔ اچھا! تو آپ وہیں رہتے ہیں؟

رسوا:۔ ان کی مصاحبت میں ہوں۔

امراو:۔ اور ان کا کیا حال ہے؟

رسوا: ۔وہ ایک حکیم صاحب پر مرتی ہیں ۔

امراو: ۔کون حکیم صاحب؟

رسوا: ۔آپ نہیں جانتیں نام بھی بتا دوں گا ۔تب بھی آپ نہ سمجھیں گی پھر کیا فائدہ ؟

امراو: ۔خیر! کچھ بتا دیجیے میں سمجھ جاؤں گی ۔

رسوا: ۔وہ نخاس ....

امراو: ۔خوب جانتی ہوں ۔یہی امیر جان اس زمانے میں ایسی تھی کہ لوگ ان کی ایک نظر دیکھنے کی آرزو رکھتے تھے ۔مزاج میں وہ تمکنت تھی کہ ایسے ویسوں کا تو ذکر کیا ہے، اچھے اچھوں کی دعا قبول نہ ہوتی تھی ۔ٹھاٹھ بھی ایسے ہی تھے چار چار مہریاں ساتھ ۔ایک گڑگڑی لیے ہے ایک کے ہاتھ میں پنکھیا ہے ایک لٹیا لیے ہے ایک کے پاس خاصدان ہے ۔خدمت گار وردیاں پہنے سواری کے ساتھ دوڑتے جاتے ہیں ۔

امیر جان گوہر مرزا کے گانے پر غش تھیں ۔خود گانا وانا جانتی نہ تھیں مگر گانا سننے کا بڑا شوق تھا ۔

گوہر مرزا بچپنے ہی سے رنڈیوں کا کھلونا تھا ۔ہر ایک اس پر دم دیتی تھی ۔صورت شکل بھی پیار کرنے کے قابل تھی ۔رنگ تو کسی قدر سانولا تھا مگر ناک نقشہ قیامت کا پایا تھا ۔اس پر نمک اور جامہ زیبی، شوخی شرارت کوئی بات ....

رسوا: ۔کیوں نہ ہو کس ماں کا بیٹا تھا؟

امراو: ۔آہا! تو کیا آپ نے بنو کو دیکھا تھا ۔

رسوا: ۔(مسکراتے ہوئے) جی ہاں! آپ یہی قیاس کر لیجیے ۔

امراو: ۔مرزا صاحب آپ کے مذاق بھی کیا در پردہ ہوتے ہیں ۔

رسوا: ۔خیر آپ نے تو پردہ فاش کر دیا ۔

امراو: ۔تو اچھا اب تھوڑی دیر مذاق رہے ۔میری سرگزشت کو آگ لگائیے ۔

رسوا:۔مذاق کے لئے شب بھر باقی ہے،آپ اپنا قصہ کہیے۔

امراو:۔دیکھیے دوسری ہوئی۔اچھا سنیے۔

صبح سے دس گیارہ بجے تک تو مولوی صاحب کے پاس سے کس کی مجال تھی کہ دم بھر کے لیے کہیں کھسک جائے۔اس کے بعد مولوی صاحب خاصہ کھانے جاتے تھےاس وقت ہم کوفرصت ملتی تھی۔پھرایک ایک کمرا ہےاورہم ہیں۔آج امیر جان کے پاس،کل جعفری کے کمرے میں،پرسوں چمّن کے یہاں پھر جہاں جاو خاطر مدارات میوہ مٹھائیاں،حقہ پان۔

رسوا:۔آپ بچپن ہی سے حقہ پیتی ہیں؟

امراو:۔جی ہاں!گوہر مرزا کو دیکھا دیکھی مجھے بھی ہوس ہوئی تھی۔شوقیہ پیتی تھی پھرتو نگوڑی لت ہوگئی۔

رسوا:۔گوہر مرزا صاحب تو چنڈو بھی پیتے تھے۔عجب نہیں آپ نے اس میں بھی ان کی ہوس کی ہو؟

رسوا:۔خدا نے اس سے تو آج تک بچایا مگرہاں افیون کی قسم نہیں کھاتی۔وہ بھی اب شروع کی ہے،کربلاے معلی سے آنے کے بعد نزلے کی شدت ہوئی آئے دن زکام رہتا تھا۔حکیم صاحب نے کہاافیون کھاؤ۔کھانے لگی۔

رسوا:۔اوروہ چیز نزلے کوروکنے والی۔

امراو:۔اب اس کا ذکر نہ کیجیے۔

رسوا:۔کیا تائب ہوگئیں۔

امراو:۔مدت سے۔

رسوا:۔واقعی کمبخت کیا بری چیز ہے اپنا تو یہ حال ہے

بعد توبہ کے بھی ہے دل میں یہ حسرت باقی
دے کے قسمیں کوئی اک جام پلادے ہم کو

امراو:۔ہائے کیا شعر کہا ہے! مرزا صاحب قسمیں دلانے کو تو میں موجود ہوں پینے نہ پینے کا آپ کا اختیار ہے۔

رسوا:۔آپ بھی شغل کیجئے گا۔

امراو:۔توبہ!

رسوا:۔توبہ!

ابر بھی ہے ہوا بھی باد بھی ہے

پھر وہ یادش بخیر یاد بھی ہے

امراو:۔لے بس اب طبیعت کو روکیے۔ جمائیاں آنے لگیں۔ للہ اس ذکر کو جانے دیجیے۔

رسوا:۔جانے دیجیے۔

امراو: مذاق سے بھی معاف رکھیے۔

اب نہ ہم منھ لگائیں گے اس کو

یاد آئی تو خیر یاد آئی

رسوا:۔واللہ! امراو جان کیا شعر کہا ہے؟

امراو:۔تسلیم!

دیکھ کر مشہد لالہ اان کو

لالہ وگل کی سیر یاد آئی

رسوا:۔ماشاءاللہ طبیعت زوروں پر ہے۔ کیوں نہ ہو عالم شباب کے ذکر کی یہ تاثیر ہے۔

امراو:۔جی نہیں۔ شراب کے ذکر کی یہ تاثیر ہے

زاہدو آج ہم کو پھر وہ شے

جس سے ہے تم کو بیر، یاد آئی

رسواؔ:۔اہاہاہا۔کیا قافیہ نکالا ہے اور کہا بھی خوب۔

کعبہ سے پھر کے ہم ہوے گمراہ

پھر وہی راہِ دیر یاد آئی

رسوا:۔اے کیا کہنا یہ ''کعبہ سے پھر کے'' کیا خوب کہا ہے!

امراو:مرزا صاحب اسے مطلع نہ کر دیجیے۔

پھر کے کعبہ سے سیر یاد آئی

پھر وہی راہِ دیر یاد آئی

رسواؔ:۔خاصہ

امراو:۔

روشِ وحش[1] و طیر یاد آئی

دشتِ وحشت کی سیر یاد آئی

رسواؔ:یہ بھی مطلع بُرا نہیں ہے۔

امراو:۔یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہم کو بنت[2] العنب سے شکوہ ہے

کیوں ہمیں اس بغیر یاد آئی

رسواؔ:۔میں تو کہتا ہوں کہ طبیعت آج جودت[3] پر ہے۔اچھا یہ شعر سن لیجیے اور پھر اپنا قصہ دُہرانا شروع کیجیے۔

ہوا بھی ابر بھی گلزار بھی، شراب بھی ہو

یہ سب بھی ہو مگر اگلا سا وہ شباب بھی ہو

امراو:۔واہ مرزا صاحب! آپ نے تو دل کو مردہ کر دیا۔خیر آمدم برسرِ مطلب۔

اسی طرح سے کئی برس میری زندگی کے خانم کے مکان پر گزرے۔اس

IqbalCyberLibrary.net
All rights reserved.
©2002-2006

درمیان میں کوئی ایسا واقعہ نہیں گزرا جس کا بیان ضروری ہو

ہاں خوب یاد آیا۔ بسم اللہ کی مسّی بڑے دھوم سے ہوئی۔ میری آنکھوں کے دیکھتے شاہی سے لے کر اب تک پھر ویسی مسّی نہیں ہوئی۔ دلارام کی بارہ دری اس جلسے کے لیے سجائی گئی تھی۔ اندر سے باہر تک روشنی تھی۔ شہر کی رنڈیاں، ڈوم ڈھاڑی، کشمیری بھانڈ سب تو تھے ہی دور دور سے ڈیرہ دار طوائفیں بلائی گئی تھیں۔ بڑے بڑے نامی گویے دلی تک سے آئے تھے، سات دن رات گانے بجانے کی صورت رہی۔ خانم نے جیسا دل کھول کے حصے تقسیم کیے ہیں اس کا آج تک شہرہ ہے۔ بسم اللہ خانم کی اکلوتی لڑکی تھی۔، جو کچھ نہ ہوتا کم تھا۔ نواب چھبن صاحب نے اپنی دادی نواب عمدۃ الخاقان بیگم کا ورثہ پایا تھا۔ بہت ہی ہم کن سن نواب زادہ تھا۔ خانم نے خدا جانے کن ترکیبوں سے کمپا مارا[1] بچارے پھنس ہی تو گئے۔ پچیس تیس ہزار روپے نواب صاحب کے اس جلسے میں خرچ ہوئے۔ اس کے بعد بسم اللہ نواب صاحب کی ملازم ہو گئیں۔ دم ہوش[2] چاہتے تھے۔

مرزا صاحب! جو باتیں آپ مجھ سے پوچھتے تھیں ان کا میری زبان سے نکلنا سخت مشکل ہے۔ یہ سچ ہے کہ رنڈیاں بہت بے باک ہوتی ہیں مگر زمانہ خاص ہوتا ہے۔

سن کا تقاضا بھی کوئی چیز ہے۔ جوشِ جوانی کی وجہ سے جو باتیں اپنی حد سے گزر جاتی ہیں سن اتر کر ان میں کمی ضرور ہونا چاہیے تا کہ اعتدال قائم رہے۔ آخر رنڈیاں بھی عورت ذات ہیں۔ ان باتوں کے پوچھنے سے آپ کو کیا فائدہ؟

رسوا:۔ کچھ تو فائدہ ہے جو میں اصرار کر کے پوچھتا ہوں اگر آپ خواندہ نہ ہوتیں تو آپ کے یہ سب عذر قابلِ سماعت ہوتے۔ پڑھے لکھوں کو ایسی بے جا شرم نہیں چاہیے۔

امراؤ:۔ وہی تو کیا پڑھنے سے آنکھوں کا پانی ڈھل جاتا ہے۔ یہ آپ نے خوب کہی۔

رسوا:۔اچھا۔اچھاتو آپ کہیے فضول باتوں سے میرا وقت نہ ضائع کیجیے۔

امراو:۔کہیں کسی اخبار میں نہ چھپوا دیجیے گا۔

رسوا:۔اور آپ کیا سمجھی ہیں۔

امراو:۔ہائے فضیحت!توبہ کیجیے۔مجھے بھی آپ اپنی طرح رسوا کریں گے۔

رسوا:۔خیر!اگر میرے ساتھ آپ رسوا ہوں گی تو کوئی بات قباحت نہیں۔

رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم
چھوڑوں گا اب نہ میں تمہیں رسوا کے بغیر

امراو:نوج آپ سے کوئی محبت کرے۔

زاہد سے گفتگو ہو کہ ناصح سے بحث ہو
بنتی نہیں ہے ذکر کسی کا کیے بغیر

رسوا:۔کس کا شعر ہے؟

امراو:۔یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھا کرتے ہیں؟

رسوا:۔ہاں سمجھا تو یہ کہیے آپ نے بھی یہ غزل سنی ہے

امراو:۔

جاتے ہیں جان بیچ کے بازارِ عشق میں
ہم آئیں گے نہ حسن کا سودا کیے بغیر

رسوا:اور وہ شعر یاد ہے تقاضا کیے بغیر۔

وعدہ ہو یا کہ قول وہ ایسے ہیں نادہند
ملتا نہیں کچھ اس کا تقاضا کیے بغیر

رسوا:۔اور کوئی شعر یاد ہے؟

امراو:۔اور تو کوئی یا نہیں آتا۔

رسوا:۔یہ تو بہت بڑی غزل تھی۔دیکھنا کہیں نقل پڑی ہو تو مجھے دکھانا۔

امراو:۔انہیں سے نہ منگوالو۔

رسوا:۔خود جاکے لکھ لاؤں تو ممکن ہے وہ ہرگز نہ لکھیں گے۔

امراو:۔یہ بھی کوئی بات ہے؟

رسوا:۔جی ہاں! آپ کو نہیں معلوم مسودے کے سوا غزل صاف کرنے تک کی قسم ہے۔

امراو:۔اچھا۔ایک دن ہم اور آپ دونوں چلیں۔ہاں ایک شعر اور یاد آیا۔

ہر چند اس میں آپ ہی بدنام کیوں نہ ہوں
باز آئیں گے نہ وہ مرا چرچا کیے بغیر

اور سنیے۔

غیروں کو ہے ستم کے تقاضے کا حوصلہ
چھوڑیں گے یہ نہ عشق کو رسوا کیے بغیر

رسوا:۔میری بھی غزل اسی طرح میں تھی۔مگر خدا نے کیا ہوئی۔صرف مقطع یاد رہ گیا تھا۔

امراو:۔مقطع پھر سنائیے کیا خوب کہا ہے۔

رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم
چھوڑوں گا اب نہ میں تمہیں رسوا کیے بغیر

امراو:۔واقعی خوب کہا ہے مگر اس میں آپ کے تخلص نے خاص لطف پیدا کیا ہے۔

رسوا:۔تخلص کا ذکر نہ کیجیے۔ایک عنایت فرما کی عنایت سے شہر میں اب کئی رسوا موجود ہیں لوگ خواہ مخواہ اپنے اچھے خاصے تخلص چھوڑ کے رسوا ہوئے جاتے ہیں۔وہ تو کہیے میرا نام جانتے نہیں تو کیا عجب ہے لوگ نام بھی بدل ڈالیں مگر میں تو خوش ہوں۔اس لیے کہ انگریزی رسم کے موافق باپ، بیٹوں کا نام ایک ہی ہوتا ہے۔یہ سب میرے روحانی فرزند ہیں۔جس قدر نسل ترقی کرے گی میرا نام روشن ہوگا۔

رسوا:۔ لے اب ٹالیے نہ۔ جو کچھ میں نے پوچھا ہے وہ کہنا ہی پڑے گا۔

امراو:۔ کیا زبردستی ہے۔ کیا بے شرمی کی باتیں آپ پوچھتے ہیں؟

رسوا:۔ باراتوں میں گالیاں گانے سے زیادہ بے شرمی نہ ہوگی۔

امراو:۔ آپ کے لکھنؤ میں تو رنڈیاں گالیاں نہیں گاتیں۔ ڈومنیاں البتہ گاتی ہیں وہ بھی عورتوں میں۔ دیہات میں رنڈیوں کو گانا پڑتی ہیں مردوں میں۔

امراؤ:۔ واقعی مرزا صاحب شہر ہو یا دیہات یہ رسم تو کچھ اچھی نہیں ہے۔

رسوا:۔ آپ کے کہنے سے اچھی نہیں ہے۔ ہم نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے اور ان کانوں سے سنا ہے اچھے اچھے شریف مرد آدمی عورتوں میں گھس کے شوقیہ گالیاں سنتے ہیں۔ ماں بہنیں پُنی جا رہی ہیں اور یہ خوش ہیں باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ آج خدا نے یہ دن دکھایا۔ کاش خدا یہ دن نہ دکھاتا! ان کے علاوہ برات کی رات بھر اور صبح کی جو بیہودگیاں باعصمت بہو بیٹیوں میں ہوتی ہیں ان کا ذکر کہیں کیا۔ خیر ان باتوں کو رہنے دیجیے اپنی بیتی کہیے۔ ہم کوئی مصلحِ قوم نہیں جو ان باتوں پر نکتہ چینی کریں۔

جب سے بسم اللہ کی مسّی ہوئی خورشید جان اور امیر جان کے کارخانے دیکھے، میرے دل میں ایک خاص قسم کی امنگ پیدا ہوئی میں نے دیکھا کہ ایک خاص رسم (جس سے میں بالکل ناواقف تھی) کے ادا ہونے کے بعد بسم اللہ سے بسم اللہ جان اور خورشید سے خورشید جان ہوگئیں۔ بیبا کی کی سند حاصل ہوگئی۔ آزادی کا خلعت مل گیا۔ اب یہ لوگ مجھے سے علیحدہ ہوگئے۔ میں ان کی نگاہوں میں حقیری معلوم ہوتی تھی۔ وہ مردوں کے ساتھ بے تکلف ہنسی مذاق کرنے لگی تھیں۔ ان کے کمرے میں جدا جدا سجا دیے گئے تھے۔ نواڑ کے پلنگ ڈوریوں سے کسے ہوئے تھے۔ فرش پر ستھری چاندنی بچھی ہوئی، بڑے بڑے نقشی پاندان، حسن دان[1]، خاصدان، اگالدان اپنے قرینوں سے رکھے ہوئے، دیواروں پر جلی آئینے، عمدہ عمدہ

تصویریں چھت میں چھت گیریاں لگی ہوئی جس کے درمیان ایک مختصر سا جھاڑ، ادھر ادھر عمدہ ہانڈیاں، سرِ شام سے دو کنوں روشن ہو جاتے ہیں۔ دو دو مہریاں، دو، دو خدمت گار ہاتھ باندھے کھڑے ہیں، خوبصورت نو جوان رئیس زادے ہر وقت دل بہلانے کو حاضر، چاندی کی گڑگڑی منھ سے لگی ہوئی ہے، سامنے پاندان کھلا ہوئے ہے، ایک ایک کو پان لگا کے دیتی جاتی ہیں، چہلیں ہوتی جاتی ہیں، اٹھتی ہیں تو لوگ بسم اللہ کہتے ہیں چلتی ہیں تو لوگ آنکھیں بچھائے دیتے ہیں، یہ ہیں کہ کسی کی پرواہی نہیں کرتیں، جو ہے انہیں کے حکم کا تابع ہے، حکومت بھی وہ کہ زمین و آسمان ٹل جائے مگر ان کا کہنا نہ ٹلے۔ فرمایشوں کا تو ذکر ہی کیا بن مانگے لوگ کلیجہ نکال نکال کے دیے دیتے ہیں۔ کوئی دل ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے، کوئی جان قربان کرتا ہے۔ یہاں کسی کی نذر ہی قبول نہیں ہوتی۔ کوئی بات نظر میں نہیں سماتی۔ بے پروائی یہ کہ کوئی جان بھی دے دے تو ان کے نزدیک کوئی مول نہیں۔ غرور ایسا کہ ہفت اقلیم کی سلطنت ان کی ٹھوکر پہ ہے۔ نازوہ جو کسی سے اٹھایا نہ جائے مگر اٹھانے والے اٹھاتے ہیں۔ انداز وہ جو مار ہی ڈالے مگر مرنے والے مر ہی جاتے ہیں۔ ادھر اس کو رلا دیا ادھر اسے ہنسا دیا۔ کسی کے کلیجے میں چٹکی لے لی۔ کسی کا دل تلووں سے مل ڈالا۔ بات بات میں روٹھی جاتی ہیں لوگ منا رہے ہیں۔ کوئی ہاتھ جوڑ رہا ہے کوئی منت کر رہا ہے قول کیا اور مکر گئیں۔ قسم کھائی اور بھول گئیں۔ محفل بھر میں سب کی نگاہ ان کی طرف ہے، یہ آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتیں پھر جدھر دیکھ لیا سب دیکھتے لگے۔ جس پر ان کی نگاہ پڑتی ہے اس پر ہزاروں نگاہیں پڑتی ہیں۔ رشک کے مارے لوگ جلے جاتے ہیں اور یہ جان جان کے جلا رہی ہیں اور لطف یہ کہ دل میں کچھ نہیں وہ بھی ہیچ یہ بھی ہیچ ہے۔ فقط بناوٹ۔ اگر وہ بچارہ اس فریب میں آ گیا پھر کیا تھا پہلے بظاہر خود مرنے لگیں۔

آج ان کو بہت ہے مری خاطر منظور

یا مری یا مرے دشمن کی قضا آئی ہے

مریں ان کے دشمن آخر اسی کو مار ڈالا۔ اب جا کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑی۔ اس غریب کے گھر میں رونا پیٹنا پڑا ہے۔ یہ بیٹھی یاروں کے ساتھ قہقہے لگا رہی ہیں۔

مرزا صاحب ان سب باتوں کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں اور بیان کر سکتے ہیں مگر یہ کہ کرشمہ دیکھ کے جو کچھ میرے دل پہ گزرتی تھی اس کو میں ہی خوب جانتی ہوں۔ عورت کو عورت سے جو رشک ہوتا ہے اس کی کچھ انتہا نہیں ہے سچ تو یہ ہے اگرچہ مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے، میرا دل چاہتا تھا کہ سب کے چاہنے والے مجھی کو چاہیں اور سب کے مرنے والے مجھی پر مریں۔ نہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھیں نہ کسی پر جان دیں مگر میری طرف کوئی آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھتا۔ بوا حسینی کو ٹھری میں چولھا بنا ہوا تھا اس کے پاس دو گھڑے رکھے ہوئے تھے یہیں دو بد قلعی سی پتیلیاں، لگن توا، رکابیاں، پیالے ادھر ادھر پڑے رہتے تھے۔ ایک کونے میں آٹے کی مٹکی تھی اس پر دو تین دالیں، نمک، مسالا، ہانڈیوں میں، اسی کے پاس جلانے کی لکڑیاں سولے ختے، مسالا پیسنے کی سل بٹا۔ خلاصہ یہ کہ تمام کرکری خانہ یہیں تھا چولھے کے اوپر دیوار میں دو کیلیں لگی تھیں، کھانا پکاتے وقت اس پر چراغ رکھ دیا جاتا تھا۔ چراغ میں پتلی سوت سی بتی پڑی ہے۔ اندھا جل رہا ہے۔ لاکھ اکساؤ لو اونچی نہیں ہوتی۔ اس کوٹھری کی آرائش میں دو چھینکے بھی تھے۔ ان میں سے ایک میں پیاز رہتی تھی اور دوسرے میں سالن دال کی پتیلی، چپاتیاں، مولوی صاحب کے واسطے ڈھانپ کے رکھ دی جاتی تھیں۔ پیاز والا چھینکا تو چولھے کے قریب تھا اور یہ دوسرا میرے سینے پر تھا جس کے بوجھ سے کھانا گویا میرے سینے پر دھرا رہتا تھا۔ اگر پلنگ پر اچانک کھڑی ہوتی تو سالن کی پتیلی کھٹ سے سر میں لگی۔

صبح سے گیارہ بجے تک مولوی صاحب کی قمچیاں اور شام سے نو بجے تک استاد کی جھڑکیاں اور گزوں کی مار۔ یہ ہمارا اخلاص پیار تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر میں

اپنے کرتوتوں سے باز نہ آتی تھی۔

اول اول تو مجھے آئینہ دیکھنے کا شوق ہوا۔ اب میرا سن چودہ برس کا تھا۔ ادھر بوا حسینی کوٹھری سے ٹلیں ادھر میں نے ان کی پٹاری سے آئینہ نکالا۔ اپنی صورت دیکھنے لگی اپنا ناک نقشہ اور رنڈیوں سے ملاتی تھی۔ مجھے اپنے چہرے بھر میں کوئی چیز بری نہ معلوم ہوتی تھی بلکہ اوروں سے اپنے کو بہتر سمجھتی تھی۔ اگرچہ درحقیقت ایسا نہ تھا۔

رسوا:۔ تو کیا آپ کی صورت کسی سے بری تھی، اب بھی سینکڑوں سے اچھی ہو۔ اس وقت تو اور بھی جوبن ہو گا۔

امراو:۔ تسلیم! خیر اب اس تعریف کو رہنے دیجیے۔ بالکل بے محل اور بے موقع ہے۔ معاف کیجیے گا مگر ہاں اس وقت میرا ایسا ہی خیال تھا اور وہ خیال میری جان کے لیے آفت تھا۔ میں دل ہی دل میں کہتی تھی ہائے مجھ میں کیا برائی ہے جو کوئی میری طرف توجہ نہیں کرتا۔

رسوا:۔ یہ تو ممکن نہیں کہ کسی کو آپ کی طرف توجہ نہ ہو۔ نگاہیں ضرور پڑتی ہونگی۔ مگر بات یہ تھی کہ آپ کی مسی نہیں ہوئی تھی۔ خانم سے لوگ ڈرتے تھے اس لیے آپ سے کوئی بولتا نہ ہو گا۔

امراو:۔ شاید یہی ہو مگر مجھے اتنی تمیز کہاں تھی۔ میری تو وہ مثل تھی بے دولتی اپنے تیہے میں آپ کھولتی۔ اپنی ہمجولیوں کو دیکھ دیکھ کے پھکی جاتی تھی۔ کھانا پینا حرام۔ راتوں کو نیند اُڑ گئی تھی۔

اسی زمانے میں پھر کنگھی کرتے وقت اور بھی صدمہ ہوتا تھا۔ اس لیے کہ کوئی چوٹی کا گوندھنے والا نہ تھا۔ جب بسم اللہ کی چوٹی نواب چھبن صاحب اپنے ہاتھ میں گوندھتے تھے، میرے سینے پر سانپ لوٹ جاتا تھا۔ یہاں کون تھا، وہی بوا حسینی۔ وہ بھی جب انہیں فرصت ہوئی نہیں تو دن دن بھر بال کھلے ہیں۔ سر جھاڑ منھ پہاڑ پھر رہی ہوں۔ آخر میں نے اپنے ہاتھ سے چوٹی گوندھنا سیکھا۔ اور سب رنڈیاں

تو دن بھر میں تین تین جوڑے بدلتی تھی۔ یہاں وہی آٹھویں دن۔ پوشاک بھی بھاری نہ تھی۔ وہ لوگ کار چوبی جوڑے بدلتے تھے۔ یہاں وہی گلبدن کا پاپجامہ، ململ کا دوپٹہ بڑی بڑائی ہوئی لچکہ کی تیلی دیدی گئی۔

اس پر بھی کپڑے بدل کے میرا جی چاہتا تھا کہ مردوں میں جا کے بیٹھوں۔ کبھی بسم اللہ کے کمرے میں چلی گئی، کبھی امیر جان کے پاس۔ مگر جہاں جاتی تھی کسی نہ کسی بہانہ سے اٹھا دی جاتی تھی۔ ان لوگوں کو میرا بیٹھنا ناگوار تھا۔ سب کو اپنی مزیداریوں کا خیال تھا مجھے کون بیٹھنے دیتا تھا۔

اور نہ بیٹھنے دینے کا ایک اور بھی سبب تھا کہ ان دنوں میری طبیعت میں شرارت کسی قدر سما گئی تھی۔ جہاں بیٹھی کسی کو ٹھینگا دکھا دیا، کسی کا منہ چڑھا دیا، کسی کے چٹکی لے لی۔ ہر طرح مردوں سے لگاوٹ کرتی تھی۔ اس وجہ سے لوگ میرے بیٹھنے کی روادار نہ تھے۔

مرزا صاحب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ گوہر مرزا ایسے وقت اور اس حال میں مجھے کس قدر غنیمت معلوم ہو سکتا تھا، اس لیے کہ وہ مجھ سے پیار کی باتیں کرتا تھا۔ میں اس کو چھیڑتی تھی وہ مجھے چھیڑتا تھا، میں اس کو اپنا چاہنے والا سمجھتی تھی اور وہ بھی ان دنوں مجھ کو چاہتا تھا۔ جب صبح مکتب میں آتا کہیں دو نارنگیاں جیب میں پڑی ہیں مجھے چپکے سے دے دیں۔ کسی دن حلوا سوہن کی ٹکیہ لیتا آتا۔ مجھ کو کھلا دی۔ ایک دن نہیں معلوم کہاں سے ایک روپیہ لایا تھا وہ بھی مجھے حوالے کر دیا۔ ہزاروں روپیہ میں نے اپنی زندگی میں اپنے ہاتھ سے اٹھائے ہوں گے مگر اس ایک روپیہ پانے کی خوشی کبھی نہ بھولوں گی۔ اس کے پہلے مجھے پیسے تو بہت ملے تھے مگر روپیہ کبھی نہ ملا تھا۔ وہ روپیہ میں نے بہت دن تک جگو لے رکھا۔ اس لیے کہ اس کے صرف کی کوئی ضرورت مجھے نہ تھی اور اگر تھی بھی تو یہ خیال تھا کہ اگر یہ صرف کرتی ہوں تو لوگ پوچھیں گے کہاں سے ملا تو کیا بتاؤنگی۔

رازداری کی سمجھ مجھے بھی آ گئی تھی۔ اور یہ سمجھ بغیر سن تمیز کو پہنچے نہیں آتی۔ بے شک میں سن تمیز کو پہنچ چکی تھی۔

ایک شاطر چور دل میرا چرا کر لے گیا
پاسباں کمبخت تو سوتے کے سوتے رہ گئے

برسات کے دن ہیں۔ آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ پانی تل دھار اوپر دھار برس رہا ہے۔ بجلی چمک رہی ہے، بادل گرج رہا ہے۔ میں بوا حسینی کی کوٹھری میں اکیلی پڑی ہوں۔ بوا حسینی خانم کے ساتھ حیدری کے گھر گئی ہوئی ہیں چراغ گل ہو گیا ہے اور اندھیری وہ کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔

اور کمروں میں جشن ہو رہے ہیں کہیں سے گانے کی آواز آ رہی ہے۔ کہیں قہقہے اُڑ رہے ہیں۔ ایک میں ہوں کہ اندھیری کوٹھری میں اپنی تنہائی پر رو رہی ہوں۔ کوئی آس پاس نہیں ہے۔ دل پر جو گزر رہی ہے دل ہی جانتا ہے۔ جب بجلی چمکتی ہے مارے ڈر کے دُلائی سے منھ ڈھانپ لیتی ہوں۔ جب گرج کی آواز آتی ہے کانوں میں انگلیاں دے لیتی ہوں۔ اسی عالم میں آنکھ لگ گئی۔ اتنے میں یہ معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میری گھگھی بندھ گئی۔ منھ سے آواز تک نہ نکلی اور آخر کار میں بے ہوش ہو گئی۔

صبح کو چور کی ڈھونڈ صیا ہوئی، وہ کہاں ملتا ہے۔ خانم منھ تھوتھائے بیٹھی ہیں۔

بوا حسینی بڑبڑاتی ہوئی پھرتی ہیں۔ میں ٹھگ ماری سی چپکی بیٹھی ہوں۔ سب پوچھ پوچھ کے تھک گئے مگر مجھے کچھ معلوم ہو تو بتاؤں۔

رسوا: ۔ یہ نہیں کہتیں کہ اگر معلوم بھی ہو تو کیوں بتاؤں؟

امراو: ۔ خیر اب حاشیے نہ چڑھائیے سنے جائیے۔

خانم کو اس دن مایوسی اور بوا حسینی کا اداس چہرہ جب مجھے یاد آتا ہے تو بے اختیار ہنسی

آتی ہے۔

رسوا:۔ کیوں نہ ہنسی آئے، ان کی تو ساری امیدیں خاک میں مل گئیں اور آپ کا مذاق ہوگیا۔

امراو:۔ امیدیں خاک میں مل گئیں۔! خانم کو آپ نہیں جانتے۔ ایک ہی لکھا بیسوا تھیں۔ اس معاملہ کو اس طرح دبایا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا اور التیام[1] کی وہ تدبیریں کیں کہ شاید باید۔

اب کسی آنکھ کے اندھے اور گانٹھ کے پورے کی تلاش ہوئی۔ آخر ایک ہدہد پھنس گیا۔

ان دنوں ملک آئین سے ایک صدر الصدور کے صاحب زادے طالب علمی کے لیے لکھنؤ میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ گھر سے خوش حال، والد مرحوم ان کے رشوت، نذرانہ کے روپیے سے ایک بڑا علاقہ ان کے صرف کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ چند روز یہاں آکر اچھے رہے پھر جو لکھنؤ کی ہوا لگی۔ علم تماش بینی میں طاق اور فنِ بے غیرتی میں مشاق ہوگئے۔ اسمِ شریف راشد علی تھا۔ راشد تخلص کرتے تھے۔ لکھنؤ کے کسی استاد نے مرشد بنادیا اس تخلص پر آپ کو بہت ہی فخر تھا۔

وطن سے جو ملازم ہمراہ آئے تھے وہ سب رکھن میاں کہتے تھے لکھنؤ والوں نے ان کو راجہ کا لقب دیا۔ مگر اس نام اور القاب میں کسی قدر دیہاتیت تھی۔ آپ لکھنؤ کی وضع قطع پر مرتے تھے اس لیے تھوڑی ہی دنوں میں نواب صاحب بن گئے۔ جب گھر سے آئے تھے تو خاصی ڈاڑھی منہ پر تھی۔ لکھنؤ کی ہوا لگتے ہی پہلے کترواں ہوئی پھر خشخاش اور تھوڑے دنوں کے بعد بالکل صفایا ہوگیا۔

ڈاڑھی منڈنے سے چھوٹا سا چہرہ کیسا بدنما نکل آیا مگر آپ اسے خوبصورتی سمجھتے تھے۔ سیاہ رنگ، چیچک کے داغ، بھدی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں گال پچکے ہوئے، تنگ پیشانی، کوتاہ گردن، ٹھنگنا سا قد، غرض کہ بہمہ صفت موصوف تھے۔

مگر آپ اپنے کو یوسف ثانی سمجھتے۔ پہروں آئینہ سامنے رہتا تھا۔ موچھیں اس قدر مڑوڑی گئیں کہ آخر چوہیا کی دم ہوگئیں۔ بال بڑھائے گئے، گھونگر بنایا گیا، نکّے دار ٹوپی سر پر رکھی گئی، اونچی چولی کا انگرکھا ڈانٹا، بڑے پائنچوں کا پجامہ پہنا گیا۔ یہ سب ٹھاٹھ رنڈیوں کی درباداری کے لیے کیا گیا تھا۔

اول تو خود ہی طبیعت بہت رساتھی دوسرے لائق احباب کی وساطت سے چند ہی روز کی بعد اونچے اونچے کمروں پر رسائی ہوگئی۔ رسائی کیسی بے تکلفی بڑھ گئی۔ چھٹن جان سے مادر پدر ہوتا ہے، بکن ٹیپیں لگاتی ہیں، حسنا نے جوتا کھینچ مارا۔ آپ ہیں کہ ٹھی ٹھی ہنس رہے ہیں۔ یہ سب کچھ تھا مگر نائکاؤں کا بڑا ادب کرتے تھے۔ جس رنڈی سے ایک شب کے لیے بھی واسطہ ہوگیا اس کی نائکہ کو مجمع عام میں اماں جان کہنا اور جھک کے تسلیم کرنا عین سعادت مندی تھی۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ یاروں پر ظاہر ہو جاتا تھا کہ آپ یہاں مشرف ہو چکے ہیں۔

سرِ شام سے دو تین گھڑی رات گئے تک خانم صاحب کا دربار کرتے تھے۔ ان کی ہر ایک نوچی کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ علم موسیقی میں بھی آپ کو کمال تھا۔ ٹھمریاں خود تصنیف فرماتے، خود ہی دھن بنا کے گاتے تھے، خود ہی بھاو بتاتے جاتے تھے اور تو جو کچھ تھا وہ تھا منھ سے طبلہ خوب بجاتے تھے۔ یاروں نے خوب بنالیا تھا۔ آپ کے اشعار پر لوگوں نے اتنی تعریف کی کہ آپ کو فخر آتش و ناسخ بنا دیا۔ مشاعروں میں ڈریالے لے گئے۔ آپ سے غزل پڑھوائی۔ تمام مشاعرہ چونک گیا۔

ریختی گویوں سے پہلے آپ کا کلام پڑھا جاتا تھا۔ ہنستے ہنستے لوگوں کو پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ آپ خوش ہوتے تھے۔ جھک جھک کے تسلیمیں کرتے تھے۔

وطن سے بےدغل وغش روپیہ چلا آتا تھا۔ اس کی والدہ بچاری اس خیال سے کہ لڑکا پڑھنے گیا ہے مولوی بن کے آئے گا۔ یہ کچھ لکھ بھیجتے تھے بھیج دیتی تھیں۔ لکھنؤ کے بےفکرے، خوش پوشاک، عیش پسند، مفت خورے آپ کے ہمراہ رہتے تھے،

انہیں لوگوں کے کہنے سننے سے کچھ خیال پیدا ہوا۔ اس خیال نے ترقی کرتے کرتے اشتیاق تک نوبت، پہنچائی۔ آخر کو عشق اس کے بعد جنون ہوگیا۔ ادھر خانم نے کھنچاوکیا۔ خانم کا یہ کہنا "نا صاحب! ابھی وہ کم سن ہے" اور ان کی التجا، منت وزاری، بے قراری آج تک مجھے یاد ہے۔ آخر دعا تعویذ کی تاثیر اور غمخواروں کی دوادوش سے پانچ ہزار روپیہ پر توڑ ٹھہوا۔ اس روپیہ کے لینے کے لیے آپ کو چند روز کے لیے وطن جانا پڑا۔ ماں سے چھپا کے دو گاؤں آپ نے رہن کر دیے بیں پچیس ہزار روپے لے کے لکھنؤ آئے۔ پانچ توڑے گن دیے۔

روپیہ عین المال دیوان جی کی معرفت خانم کے خزانہ عامرہ میں داخل ہوا۔ بوا حسینی نے پاؤں پھیلائے۔ پانچ سو روپیہ نذر و نیاز کے نام سے لے مریں۔ خلاصہ یہ کہ میں آپ کے سر منڈھی گئی۔ چھ مہینے تک آپ لکھنؤ میں رہے، سو روپیہ ماہوار دیتے تھے۔ فرمائش کا ذکر نہیں جو کچھ مجھے خفیہ دیا وہ بوا حسینی کے پاس رہتا تھا۔ خانم کو اس کی خبر نہ تھی۔ اب میں گویا آزاد تھی۔ دو مہریاں، دو خدمت گار میرے لیے خاص ملازم ہوئے۔ پھاٹک کے پاس والا کمرے میرے رہنے کے لیے دیا گیا۔ دو چار مرد آدمی شریف زادے، نواب زادے میرے پاس بھی آ کے بیٹھنے لگے۔

گلِ چین اول گوہر مرزا ہر زمانے میں مجھ سے برابر ملتا رہا۔ خانم اور بوا حسینی اس کی صورت سے جلتی تھیں۔ مجھے محبت تھی اس لیے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ ادھر گوہر مرزا کے والد نے انتقال کیا جو آمدنی وہاں سے تھی وہ بند ہوگئی۔ بنو بڑھیا ہو چکی تھیں کوئی پوچھتا نہ تھا۔ اس لیے گوہر مرزا کے صرف کی خبر گیری میرے ہی ذمہ تھی۔

سب رنڈیاں قاعدہ ہے کہ ایک نہ ایک کو اپنا بنا رکھتی ہیں۔ ایسے شخص سے بہت زیادہ فائدہ ہوتا تھا۔ ایک تو یہ کہ جب کوئی نہ ہوا تو اسی سے دل بہلایا۔ سودے سلف کا آرام رہتا ہے آدمی سے منگاؤ تو کچھ نہ کچھ کھا جائے گا۔ یہ مارے خیر خواہی کے اچھی سی اچھی چیز شہر بھر سے ڈھونڈ کے لاتے ہیں۔ بیمار پڑو تو حد سے زیادہ

خدمت کرتے ہیں۔طرح طرح کے آرام دیتے ہیں، رات بھر پاؤں دباتے ہیں۔ صبح کو دوا بنا کے پلاتے ہیں، حکیم صاحب سے حال کہنے جاتے ہیں، دوست آشناؤں سے تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔چرکٹ پھنسا کے لاتے ہیں جہاں شادی بیاہ ہوا ناچ کا انتظام اپنے ذمہ لے کے مجرے میں انہیں کو لے جاتے ہیں۔محفل میں بیٹھ کے اہلِ محفل کو متوجہ کرتے ہیں۔وہ ناچ رہی ہے یہ تال دیتے جاتے ہیں۔ ہر سم پر آہ کہتے ہیں۔ ہر تال پر واہ واہ کر رہے ہیں۔وہ بھاو بتا رہی ہے یہ شرح کرتے جاتے ہیں۔انہیں کی وجہ سے اچھے سے اچھا کھانے کو ملتا ہے۔خاطر مدارات اور رنڈیوں سے زیادہ ہوتی ہے۔انعام و اکرام سوا ملتا ہے۔اگر کسی امیر رئیس سے ملاقات ہوگئی انہیں کی بدولت اس کو لطف رقابت حاصل ہوتا ہے۔ادھر وہ چاہتے ہیں کہ رنڈی ہم کو چاہنے لگے ادھر رنڈی جان جان کے ان کا کلمہ بھر رہی ہے۔کبھی یہ فقرہ ہے: صاحب میں ان کی پابند ہوں نہیں معلوم آپ سے کیوں کر ملتی ہوں۔اب ان کے آنے کا وقت ہے مجھے جانے دیجیے وہ تو ہمیشہ کے ہیں آپ اس طرح کیا نباہیے گا۔

تماش بین ان سے دبتے رہتے ہیں اگر کسی سے تکرار ہوئی یہ حمایت کو مستعد شہر کے بانکے ترچھوں سے ملاقات، بات کی بات میں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو سکتے ہیں۔تماش بین ایک طرف خونا نکہ پر دباو رہتا ہے۔ ہر وقت یہ خوف لگا رہتا ہے کہ رنڈی ان کو پیار کرتی ہے کہیں ایسا نہ ہو ان کے گھر جا بیٹھے۔

امیر جان کاظم علی پر مرتی تھیں۔برسوں اپنے پاس سے روپیہ دیا۔ایک مرتبہ پانچ سو کے کڑے اتار کے دے دیے اور صبح کو غل مچا دیا کہ کوئی اتار کے لے گیا۔ ایک دفعہ جھالے لی کی ایک فرد گیارہ سو کے جوڑ کی دے دی اور کہہ دیا کہ عیش باغ کے میلے میں کان سے گر گئی۔اسی طرح ہزاروں روپیہ کا سلوک کیا۔گھر بھر کی روٹیاں امیر جان کی بدولت تھیں۔

خود وہ پیارے صاحب پر جان دیتی تھی۔ بسم اللہ کا کوئی آشنا نہ تھا طبیعت میں سفلہ پن تھا۔ کسی پر بند نہ تھیں۔

اوروں کا ذکر کیا۔ خانم صاحب پچاس پچپن برس کے سن میں میر اولاد علی پر جان دیتی تھیں۔ میر صاحب کا سن اٹھارہ انیس برس کا تھا۔ صورت دار جوان تھے۔ کسرتی بدن تھا۔ اچھے اچھوں کی نگاہ پڑتی تھی۔ خانم کا رعب غالب تھا۔ کیا مجال کوئی بات کر سکے۔ بے چارے غریب آدمی تھے۔ نانِ شبینہ کو محتاج، خانم کی بدولت سارا کنبہ پرورش پاتا تھا۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ لگا کے شادی کر دی مگر برات کی رات کے سوا میر صاحب کو کبھی شب کو گھر میں سونا نصیب نہیں ہوا۔ دن رات یہیں رہتے تھے۔ گھڑی کی گھڑی گھر بھی ہو آتے تھے۔

ایک اور مرزا صاحب کوئی ستر برس کا سن کمر جھکی ہوئی، نہ منھ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ خانم صاحب کے قدیم آشناؤں میں تھے۔ اب ان سے کوئی واسطہ نہ تھا مگر گھر والوں کی طرح رہتے تھے۔ صبح شام کھانا خانم کے ساتھ کھاتے تھے۔ کپڑا خانم بنا دیتی تھی۔ افیم، گنڈیریاں، ریوڑیاں ان سب اخراجات کا بار خانم کے سر تھا۔ ایک دن ہم لوگ خانم صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ خورشید جان غمزدہ صورت بنائے بیٹھی ہیں۔

کیوں؟ پیارے صاحب کی شادی ہوتی ہے ان پر غم سوار ہے خانم نے برائے فہمائش کہا جاؤ چھوکریو نہیں معلوم اس زمانے کی محبتیں کس قسم کی ہیں جیسے رنڈیاں ویسے ان کے آشنا۔ ایک ہمارا زمانہ تھا۔ دیکھو مرزا صاحب کی طرف اشارہ کر کے) ایک یہی مرد آدمی بیٹھے ہیں جوانی میں مجھ سے آشنائی ہوئی۔ ماں باپ نے شادی ٹھہرائی۔ آپ مانجھے کا جوڑا پہن کے مجھے دکھانے آئے۔ میں نے مانجھے کے جوڑے کے پرزے پرزے کر دیئے۔ ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئی کہ میں تو نہ جانے دوں گی، چالیس برس کا زمانہ گزرا، آج تک تو گھر نہیں گئے، کوئی ہے کوئی ایسا تمہارا

بھی؟ سب نے سر جھکا لیا۔

یوں تو بسم اللہ کی مِسّی میں میں پہلے پہل ناچی گائی تھی۔ مگر پہلا مجرا میرا نواب شجاعت علی خاں کے لڑکے کی شادی میں ہوا تھا۔ وہ محفل بھی یادگار تھی۔ نواب کی بارہ دری کس شان سے سجی گئی تھی۔ بیش قیمت شیشہ آلات[1] کی روشنی سے رات کو دن ہو گیا۔ صاف ستھرا فرش، ایرانی قالین، زربفت کے مسند تکیے۔ سامنے رنگ رنگ کے مرد[1] لنگوں کی قطار روشن۔

عطر اور پھولوں کی خوشبو سے تمام بارہ دری بسی ہوئی تھی۔ دھواں دھار حقوں کی خوشبو، گلوریوں کے مہک سے دماغ معطّر تھے۔ میرا سن کوئی چودہ برس کا تھا۔ اس زمانے میں بڑودے سے ایک بائی جی آئی ہوئی تھیں۔ تمام شہر میں ان کے گانے کی دھوم تھی۔ بڑے بڑے گویئے کان پکڑتے تھے۔ معلومات ایسی کہ پوتھیاں گویا نوکِ زبان تھیں۔ گلا وہ چار محلے ادھر آواز جائے۔ مگر واہ خانم صاحب واقعی کیا رنگ دیکھتی تھیں۔ ان کے بعد مجھ کو کھڑا کر دیا۔ مجھے تو کیا تمیز تھی مگر سمجھ دار لوگ حیران تھے کہ خانم صاحب کیا کرتی ہیں بھلا بائی جی کے سامنے اس چھوکری کا رنگ چمکے گا؟

پہلے گت شروع ہوئی۔ اس میں محفل کچھ میری طرف مخاطب ہوئی۔ میری بھی اٹھتی جوانی تھی، صورت اچھی نہ تھی مگر اس وقت کی پھرتی، چالاکی، الھڑ پن۔

کچھ نہ پوچھو شباب کا عالم
کیا کہوں کچھ عجب زمانہ تھا

گت تھوڑی ہی دیر ناچی ہوں گی کہ خانم نے یہ غزل شروع کرا دی۔

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے
دیکھیے دیکھیے اک آن میں کیا ہوتا ہے

اس غزل کے شروع کرنے کے ساتھ ہی محفل تہ و بالا ہو گئی۔ اس کے بعد

دوسرا مطلع اک ذرا بتا کے جو گایا اہل محفل جھومنے لگے۔

نالہ رکتا ہے تو سرگرمِ جفا ہوتا ہے

درد تھمتا ہے تو بیدرد خفا ہوتا ہے

اور اس شعر نے تو قیامت ہی برپا کر دی۔

پھر نظر جھینپتی ہے آنکھ جھکی جاتی ہے

دیکھیے دیکھیے پھر تیر خطا ہوتا ہے

اس شعر کا یہ حال تھا کہ جس سے نظر ملا کے گایا نظر نہ اٹھا سکا۔

بت پرستی میں نہ ہوگا کوئی مجھ سا بدنام

جھینپتا ہوں جو کہیں ذکرِ خدا ہوتا ہے

ذرا شعر کو سنیے اور قیاس کیجیے عاشق مزاجوں پر اس کا کیا اثر ہوا ہوگا؟

عشق میں حسرتِ دل کا تو نکلنا کیسا

دم نکلنے میں بھی کمبخت مزا ہوتا ہے

پھر اس کے بعد یہ شعر پڑھا۔

حالِ دل ان سے نہ کہنا تھا ہمیں چوک گئے

اب کوئی بات بنائیں بھی تو کیا ہوتا ہے

تمام محفل پر وجد کا عالم طاری تھا۔ ہر شخص محظوظ تھا۔ ہر لفظ پر واہ! ہر سم پر ہاہاہا۔ ایک ایک شعر آٹھ آٹھ دس دس مرتبہ گوایا گیا۔ پھر بھی سیری نہیں ہوتی تھی۔ اسی غزل پر میرا مجرا موقوف ہوا۔ دوسرے مجرے میں پھر یہی گوائی گئی۔

مرزا رسوا:۔ وہ خیر محفل کا جو حال ہوا ہو۔ از برائے خدا اور جس قدر شعر اس غزل کے یاد ہوں سنا دیجیے۔ یہ کس کی غزل ہے؟

امراو:۔ اوئی۔ کیا آپ نہیں جانتے؟

رسوا:۔ میں سمجھا۔

امراو:۔اور شعر سنیے۔

تالبِ گور پہنچ جاتے ہیں مرنے والے
وہ بھی اس وقت کہ جب شوق رسا ہوتا ہے

رسوا:۔سبحان اللہ!

امراو:۔واقعی قلم توڑ دیا ہے۔

آہ میں کچھ بھی اثر ہو تو شرربار کہوں
ورنہ شعلہ بھی حقیقت میں ہوا ہوتا ہے

رسوا:۔یہ فلسفہ ہے اسے وہی خوب سمجھتے ہیں۔

امراو:۔اور سنیے۔

کس قدر معتقدِ حسنِ مکافات ہوں میں
دل میں خوش ہوتا ہوں جب رنج سوا ہوتا ہے

رسوا:۔یہ بھی فلسفہ ہے اسے وہی خوب سمجھتے ہیں

امراو:۔اور سنیے۔

شوقِ اظہار اگر ہے تو مرے دل کو نہ توڑ
اسی آئینہ میں تو جلوہ نما ہوتا ہے

رسوا:۔یہ تصوف ہے ہم دنیا کے لوگ ہیں ہمیں اس سے کچھ غرض نہیں۔مگر ''شوقِ اظہار'' یہ لفظیں کیوں کر مل جایا کرتی ہیں

امراو:۔مقطع سنیے۔

ہرج میں نالہ وفریاد سے باز آ......[لے]
ایسی باتوں سے وہ بیدرد خفا ہوتا ہے

رسوا:۔مطلع سے مقطع نکالا ہے مقطع کہنے کی فرصت نہ ملی ہوگی۔

امراو:۔فرصت انہیں کب ملتی ہے؟

پہلے مجرے کے دوسرے دن ابو حسینی میرے کمرے میں آئیں، ایک خدمت گار ان کے ساتھ تھا۔

بوا حسینی:۔دیکھو امراو صاحب یہ کیا کہتا ہے۔؟

اتنا کہہ کے بوا حسینی کمرے کے باہر چلی گئیں۔

خدمتگار:۔(سلام کر کے) مجھ نواب سلطان صاحب نے بھیجا ہے جو کل شب کو محفل میں زرد مندیل[2] سر پر رکھے دولہا کے داہنی طرف بیٹھے تھے، اور فرمایا ہے کہ کسی وقت آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں بشرطیکہ جس وقت میں آؤں اس وقت کوئی اور نہ ہو اور اس غزل کی نقل مانگی ہے جو آپ نے کل گائی تھی۔

میں:۔نواب صاحب سے میری تسلیمات کہنا اور کہنا شام کو جب چاہیے تشریف لائیے تخلیہ ہو جائے گا۔غزل کے لیے کل دن کو کسی وقت آنا دیکھ دوں گی۔

دوسرے دن پہر دن چڑھے خدمت گار آیا۔میں کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ غزل کی نقل میں نے کر رکھی تھی، اس کے حوالے کی۔اس نے پانچ اشرفیاں کمر سے نکال کے مجھے دیں اور کہا نواب صاحب نے کہا ہے کہ آپ کے لائق تو نہیں مگر خیر پان کھانے کے لیے میری طرف سے قبول کیجیے۔آج شب کو چراغ جلنے کے بعد میں ضرور آؤں گا۔

خدمت گار سلام کر کے رخصت ہوا۔اس کے جانے کے بعد پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ بوا حسینی کو بلا کے یہ اشرفیاں دے دوں۔وہ خانم کے حوالے کریں۔پھر ایک دفعہ جو اشرفیوں کی طرف دیکھا چمکتی نئے گھن[1] کی اشرفیاں! بھلا میرے دل سے کب نکلتی تھیں۔اس وقت صندوقچہ وندوقچہ تو میرے پاس نہ تھا پلنگ کے پائے کے نیچے دبا دیں۔

مرزا رسوا صاحب میر کے نزدیک ہر عورت کی زندگی میں ایک وہ زمانے آتا ہے جب وہ چاہتی ہے کہ اسے کوئی چاہے۔ یہ نہ سمجھیے گا کہ خواہش چند روزہ ہوتی ہے بلکہ عنفوانِ شباب سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور سن کے ساتھ ہی اس کا نشو و نما ہوتا رہتا ہے۔ جس قدر سن بڑھتا ہے اسی قدر یہ خواہش بڑھتی رہتی ہے۔

گوہر مرزا بے شک میرا چاہنے والا موجود تھا مگر اس کی چاہت اور قسم کی تھی۔ اس کی چاہت میں ایک بات کی کمی تھی جسے میرا دل ڈھونڈتا تھا مردانہ ہمت کو اس کی طینت میں لگاؤ نہ تھا۔ ماں کا ڈومنی پنا اس کے خمیر میں داخل تھا۔ وہ جو کچھ پاتا تھا مجھ سے چھین جھپٹ کے لے لیتا تھا۔ خود ایک روپیہ کے سوا جس کو میں کہہ چکی ہوں کبھی نہیں دیا۔ اب میرا دل ایسا عاشق ڈھونڈتا تھا جو میری ناز برداری کرے۔ روپیہ خرچے، کھلائے پلائے۔ نواب سلطان صاحب، (نواب صاحب کا یہی نام آدمی نے بتایا تھا) صورت شکل کے اچھے تھے۔ اُن کے چہرے پر اس قسم کا رعب تھا جس پر عورت ہزار دل سے فریفتہ ہو جاتی ہے۔ بعض لوگ غلطی سے یہ خیال کرتے ہیں کہ عورت کو صرف خوشامد اور اظہارِ عشق پسند ہے۔ بے شک پسند ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس میں ذرا بھی کمینہ پن نہ ہو۔ جو لوگ رنڈیوں کا گھنا تا کتے ہوئے آتے ہیں جن کے ہر کنائے سے یہ مدعا نکلتا ہے کہ ہمیں چاہو، خدا کے لیے چاہو، چاہو اور ہمارے گھر پڑ جاؤ، جو کچھ تمہارے پاس ہے ہمیں دے دو اور ہمارے گھر کی، ماما گیری کرو، روٹیاں پکا پکا کے کھلاؤ ہمارے اور ہمارے بال بچوں کی جوتیاں سیدھی کرو۔ ہر شخص کا حسن حضرت یوسفؑ کا معجزہ نہیں ہے کہ ہر ایک عورت اس پر جان دینے لگے۔ مرد عورت سے اور عورت مرد سے محبت کرتے ہیں مگر اس محبت میں اکثر اغراض ذاتی کا بھی لحاظ رہتا ہے۔ بے غرض محبت جیسے لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، یا سب قصے کہانیوں میں سنی جاتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک طرفہ محبت نہیں ہوتی۔ ہم نے اسے بھی آنکھوں سے دیکھا ہے مگر اس کو خللِ دماغ سمجھنا چاہیے۔ پھر کیا ضرور ہے

کہ مرد عورت دونوں دیوانے ہوں۔

دوسرے دن شب کو نواب صاحب تشریف لائے۔بوا حسینی سے معمولی گفتگو کے بعد تعین اخراجات ہو کر کمرے میں تخلیہ ہو گیا۔معلوم ہوا کہ نواب صاحب نے ملازم نہیں رکھا صرف یہ طے ہوا کہ کبھی کبھی رات کو گھڑی دو گھڑی کے لیے آیا کریں گے۔نواب صاحب بہت ہی کم سخن بھولے آدمی تھے۔سن اٹھارہ انیس برس کا تھا۔بسم اللہ کے گنبد میں پرورش پائی تھی۔ماں باپ کے دباؤ میں تھے۔دنیا کے جعل فریب سے بالکل آگاہ نہ تھے۔اظہارِ تعشق خدمت گار کی زبانی ہو چکا تھا ورنہ نواب صاحب کو اس میں بھی کسی قدر مشکل ہوتی مگر میں نے تھوڑی دیر میں بے تکلف بنا لیا۔

بہت سی لگاوٹ کی باتیں کیں بالکل عاشقِ زار بن گئی۔اس میں کچھ سچ تھا کچھ جھوٹ۔سچ تو اس لیے کہ نواب صاحب کی صورت ایسی تھی کہ ایک عورت خواہ کیسی ہی سخت دل کیوں نہ ہو ان پر مائل ہو جائے۔گوری گوری رنگت جیسے گلاب کا پھول، ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، خوبصورت جبیں، گھونگھر والے بال، کتابی چہرہ، اونچا ماتھا، بڑی بڑی آنکھیں، بھرے بھرے بازو مچھلیاں پڑی ہوئی، چوڑی کلائیاں، بلند بالا کسرتی بدن، خدا نے سر سے لے کر پاؤں تک تمام بدن نور کے سانچے میں ڈھالا تھا۔اس پر بھولی بھولی باتیں، بات بات میں عاشقانہ شعر جن میں اکثر انہیں کی تصنیف، شعر پڑھنے میں ہوا و لے ٹوٹا ہوا تھا۔خاندانی شاعر تھے۔

مشاعروں میں اپنے والد کے ساتھ غزل پڑھتے تھے۔

شاعروں کو کیسا ہی عاشقانہ شعر ہو کسی کے سامنے پڑھتے ہوئے جھینپ نہیں ہوتی۔خورد بزرگ کے سامنے اور بزرگ خورد کے سامنے چاہے اور قسم کی گفتگو نہ کر سکتے ہوں مگر شعر پڑھنے میں تکلف نہیں ہوتا۔شعر بھی ایسے کہ اگر نثر میں ان کا مطلب ادا کیا جائے تو منھ سے کہتے نہ بنے۔غرض کہ اس شب کو بڑے مزے کی

صحبت رہی۔

نواب:۔آپ کی اداؤں نے تو مجھے ایسا فریفتہ کرلیا کہ بغیر آپ کے دیکھے مجھے چین ہی نہیں آتا۔

میں:۔یہ سب آپ کی قدر دانی ہے ورنہ میں کیا میری حقیقت کیا۔

ایاز قدر خود شناش من آنم کہ من آنم[1]

نواب:۔اوہو! آپ تو خواندہ معلوم ہوتی ہیں۔

میں:۔جی ہاں کچھ شُد بُد پڑھا تو ہے۔

نواب:۔اور لکھنا جانتی ہو؟

میں:۔جی ہاں لکھ بھی لیتی ہوں۔

نواب:۔تو وہ غزل آپ ہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے؟

میں:۔مسکرا کے چپ ہو رہی۔

نواب:۔واللہ کیا پیارا خط ہے۔اس بات سے تو بہت ہی جی خوش ہوا۔خدمت گاروں سے دل کا حال کہتے نہیں بنتا۔اب زبانِ قلم سے گفتگو ہوا کرے گی۔ہم تو ایسا چاہتے ہی تھے۔جہاں تک ہو سکے ایسے معاملے میں غیر کی وساطت نہ ہو۔

نہ غیروں کی وساطت ہو نہ یاروں کی شماتت[1] ہو

جو ہیں آپس کی باتیں رازدار اُن کے ہمیں تم ہوں

میں:۔یہ آپ ہی کا شعر ہے؟

نواب:۔جی نہیں۔والد مرحوم نے فرمایا تھا۔

میں:۔کیا خوب فرمایا ہے!

نواب:۔ماشاءاللہ! آپ کو شاعری کا مذاق بھی ہے۔

اچھی صورت جو خدا دے تو یہ اوصاف بھی دے

حُسنِ تقریر بھی ہو خوبیِ تحریر بھی ہو

میں:۔یہ کس کا شعر ہے؟

نواب:۔انھیں کا۔

میں:۔کیا خوب فرمایا ہے!

نواب:۔جی ہاں!وہ ایسا ہی فرماتے تھے مگر واللہ آپ کی شان کے لائق ہے۔

میں:۔

یہ فقط آپ کی عنایت ہے
ورنہ میں کیا مری حقیقت کیا

نواب:۔واہ کیا صاف شعر ہے!

میں:۔تسلیم!

نواب:۔یہ کہیے آپ بھی شعر بھی کہتی ہیں۔

میں:۔جی نہیں آپ ایسے قدر دانوں سے کہوا لیتی ہوں۔

اس بات پر نواب صاحب پہلے تو اک ذرا چیں بجبیں ہوئے پھر مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ کر ہنس پڑے۔

نواب:۔خوب کہی۔جی ہاں اکثر رنڈیوں کا یہ وتیرہ ہے کہ یاروں سے کہوا کے اپنے نام سے پڑھا کرتی ہیں۔

میں:۔آپ رنڈیوں کو ایسا نہ کہیے کیا مرد ایسا نہیں کرتے؟

نواب:۔واللہ سچ ہے۔والد مرحوم کے دوستوں میں اکثر ایسے صاحب ہیں جنھوں نے کبھی ایک مصرع نہیں کہا اور ہر مشاعرے میں غزل پڑھنے کو مستعد! اکثر والد ہی کہہ دیا کرتے تھے۔کبھی ایسا ہوتا تھا کہ میری غزل میں شعر زائد ہوئے چھانٹ دیے۔میں کہتا ہوں اس میں لطف ہی کیا ہے۔والد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے حضرت استاد کے بنائے ہوئے شعر دیوان سے نکال ڈالے۔جھوٹی تعریفوں سے دِل کو کیا خوشی ہوتی ہوگی۔

میں :۔خدا جانے !یہ بھی ایک ہوس ہے اور بُری ہوس۔

نواب :۔اچھا تو اس غزل کا اور کوئی شعر یاد ہے تو پڑھیے۔

میں :

فرض ہے ضبطِ نالہ وُ فریاد

جس سے ناخوش ہو تم وہ عادت کیا

نواب :۔کیا شعر پڑھا ہے پھر پڑھیے گا واللہ کیا نئی بات کہی ہے۔

میں :۔(شعر دوبارہ پڑھ کے)تسلیم !آپ قدردانی کرتے ہیں۔

نواب :۔شعر ہی اچھا ہے۔اور کوئی شعر پڑھیے۔

میں :۔اس طرح میں میری غزل نہیں۔یہ دو شعر ابھی کہے ہیں۔

نواب :۔ یہ اور طرّہ ہوا۔ فی لبدیہہ اور ایسے شعر۔اچھا اور کسی غزل کے شعر پڑھیے۔

میں :۔اب آپ ارشاد کیجیے۔اِس لیے میں نے سبقت کی تھی۔

نواب :۔میں پڑھے دیتا ہوں مگر آپ کو غزل پڑھنا ہوگی۔

اتنے میں کمرے کا دروازہ دھڑاک سے کھلا اور ایک صاحب پچاس پچپن برس کا سن ،سیاہ رنگت، بڑھی داڑھی، ترچھی پگڑی باندھے، کمر بندھی ہوئی، کٹار لگی ہوئی کمرے کے اندر گھس آئے اور آتے ہی نہایت بے تکلفی سے میرا زانو دبا کے بیٹھ گئے۔نواب صاحب نے میری طرف دیکھا۔میں نے سر جھکالیا۔کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔کہاں تو نواب صاحب سے یہ اقرار تھا کہ بالکل تخلیہ ہوگا۔کمرے میں کوئی نہ ہوگا۔کس مزے کی گفتگو، کیا ستھرا نداق تھا، کیا راز و نیاز ہورہا تھا کہاں یہ بلائے مہیب نازل ہوئی۔سنگ آمد و سخت آمد۔

ہائے کیا مزے کی صحبت تھی۔اس کمبخت نے کیسا مزے میں خلل ڈالا۔نواب ابھی غزل پڑھنے کو تھے اس کے بعد میں بھی کچھ کہتی۔نواب تعریفیں کرتے، کیا دل

خوش ہوتا۔ آج ہی تو ایک ایسا قدر دان ملا تھا جسے مدتوں سے میرا دل ڈھونڈ تا تھا اور آج ہی اس آفت کا سامنا ہوا۔ خدا اس موے کو جلدی یہاں سے اڑائے۔ یہ خیالات میرے دل میں تھے اور وہ خوں خوار صورت آنکھوں کے سامنے تھی جس کی طرف دیکھنے سے میرا دل لرزا جاتا تھا۔ یہ تو میری جان کو گویا دلاور خاں ہو گیا۔ مجھے بار بار اندیشہ تھا کہ کٹار جو اس کے کمر میں ہے، یا میرے کلیجہ کے پار ہو گی یا خدا نخواستہ نواب کو کچھ گزند پہنچائے گی۔ دل ہی دل کوستی تھی خدا غارت کرے موا کہاں سے اس وقت آ گیا۔

آخر مجھ سے اور تو کچھ نہ بن پڑا۔ بوا حسینی کو آواز دی۔ انھوں نے آکے یہ ماجرا دیکھا۔ سمجھ گئیں۔ بوا حسینی کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ ان صاحب کو کچھ جانتی بھی تھیں۔

بوا حسینی: ۔خاں صاحب مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے ادھر تشریف لائیے۔

خاں صاحب: ۔جو کچھ کہنا ہے وہیں سے کہو۔ ہم لوگ کہیں بیٹھ کے اٹھتے ہیں۔

بوا حسینی: تو خاں صاحب کوئی زبردستی ہے؟

خاں صاحب: ۔اس میں زبردستی کیا۔ رنڈیوں کے مکان پر کسی........کا اجارہ نہیں اور زبردستی ہی سہی، ہم تو نہیں اٹھنے کے۔ دیکھیں تو ہمیں کون.......اٹھا دیتا ہے؟

بوا حسینی: ۔اجارہ کیوں نہیں؟ جو زرخرچ کرے گا رنڈی اسی کی ہے۔ پھر اور کوئی اس وقت نہیں آ سکتا۔

خاں صاحب: ۔تو زرخرچنے کو ہم نابرابر ہیں؟

بوا حسینی: ۔اچھا اس وقت اِس کا موقع نہیں اور کسی وقت تشریف لائیے گا۔

خاں صاحب: ۔عورت پچھواہی کھوئی ہے۔ کہہ دیا کہ ہم نہیں اٹھیں گے۔

میں نے دیکھا کہ نواب صاحب کا چہرہ مارے غصہ کہ سرخ ہو گیا مگر ابھی تک بیٹھے رہے کچھ منھ سے نہیں بولے۔

بوا حسینی:۔ بیٹی۔ اچھا تو اٹھ کے ادھر چلی آ۔ نواب صاحب! آپ کے آرام کا وقت ہے۔ کوٹھے پر تشریف لے جائیے۔

میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو اس نگوڑمارے نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب کیا کروں؟

نواب:۔ خاں صاحب رنڈی کا ہاتھ چھوڑ دیجیے اسی میں خیریت ہے۔ آپ بہت کچھ زیادتیاں کر چکے ہیں۔ میں خاموش بیٹھا رہا صرف اس خیال سے کہ رنڈی کے مکان پر تہتک کرنا اچھا نہیں۔ مگر اب............

خاں صاحب:۔ مگر اب تم کیا کر سکتے ہو۔ دیکھیں تو کون.........رنڈی کا ہاتھ چھڑا لیتا ہے۔

میں:۔ (زور سے ہاتھ جھٹک کر) اچھا تو ہاتھ چھوڑ دیجیے میں کہیں جاتی نہیں۔ (واقعی میں نواب کو چھوڑ کر ہرگز نہیں جاتی۔)

خاں صاحب نے ہاتھ چھوڑ دیا۔

نواب:۔ میں کہے دیتا ہوں کہ ذرا زبان سنبھال کے گفتگو کیجیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شریفوں کی صحبت نہیں اُٹھائی۔

خاں صاحب:۔ خیر تم نے تو شریفوں کی صحبت اُٹھائی ہے۔ جو کچھ ہو سکے کر لو۔

نواب:۔ یہ تو معلوم ہوا کہ آپ لڑنے پر آمادہ ہیں مگر رنڈی کا مکان کوئی اکھاڑہ نہیں ہے نہ میدان۔ بہتر ہے کہ اس کو کسی اور وقت پر موقوف رکھیے اور آپ تشریف لے جائیے نہیں تو............

خاں صاحب: نہیں تو تم مجھے گھول کے پی جاؤ گے۔ تشریف لے جائیے۔ یہ ایک ہی کہی۔ تمھیں نہیں چلے جاتے۔

نواب:۔ خاں صاحب! جنابِ امیر کی قسم میں بہت طرح دیتا ہوں۔ اس لیے کہ مجھے کسی قدر اپنی عزت کا خیال ہے۔ والدین، عزیز، دوست جو سنے گا نام رکھے گا

ورنہ آپ کو ابھی ان گستاخیوں کا مزہ چکھا دیتا۔ پھر میں آپ سے کہتا ہوں کہ بے فائدہ حجت نہ کیجیے۔ تشریف لے جائیے۔

خاں صاحب:۔ رنڈی کے گھر پر تو آتے ہو اور اماں جان سے ڈرتے ہو۔ گستاخیاں کیسی تمھارے باپ کا نوکر ہوں۔ تم اپنے گھر کے رئیس زادے ہو تو ہوا کرو۔ رنڈی کے مکان پر تم بھی بیٹھے ہو ہم بھی بیٹھے ہیں۔ جب ہمارا جی چاہے گا جائیں گے۔ تم خود بے کار حجت کرتے ہو۔ کسی کو اٹھاتے نہیں دیکھا۔

نواب:۔ اٹھا دینا تو کوئی مشکل نہیں۔ خدمت گاروں کو آواز دیتا ہوں تو آپ کی گردن میں ہاتھ دے کے نکال دیتے ہیں۔

خاں صاحب:۔ خدمت گاروں کے بل پر نہ بھولنا یہ کٹار بھی دیکھا ہے۔

نواب:۔ ایسے بہت کٹار دیکھے، جو وقت پر کام آوے وہ کٹار ہے۔ آپ کی کٹار میان سے نکلتی رہے گی یہاں تو ابھی آپ کی گردن ناپ دی جائے گی پھر دیکھا جائے گا۔

خاں صاحب:۔ لے اب تمھیں گھر کو چلے جاؤ اماں جان یاد کرتی ہوں گی۔

میں دیکھ رہی تھی کہ نواب کا چہرہ بالکل متغیر ہو گیا ہے۔ مارے غصے کے تھر تھر کانپ رہے ہیں مگر واہ ری شرافت، اس پاجی نے کتنا سخت سست کہا مگر یہ آپ ہی آپ کر کے بات کر رہے ہیں۔ اس سے مجھے پہلے تو یہ خیال تھا کہ نواب ڈر گئے مگر یہ خیال میرا غلط نکلا۔ واقعی نواب کو اپنی عزت کا خیال تھا۔ اسی لیے طرح دے رہے تھے۔ چاہتے تھے کہ معاملہ سہولت سے رفع دفع ہو جائے مگر اس پاجی کی بد زبانی بڑھتی جاتی تھی۔ جس قدر نواب طرح دیتے تھے وہ اور شیر ہوتا جاتا تھا۔ آخر نواب نے کہا۔

نواب:۔ اچھا اٹھیے خاں صاحب ہم آپ دونوں یہاں سے چلے چلیں عیش باغ میں چل کے ہمارے آپ سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔

خاں صاحب:۔ (قہقہہ مار کے) صاحب زادے ابھی تم خود منہ چومنے کے لائق ہو اور مردوں سے خانہ جنگی کرنے کا حوصلہ! کہیں کوئی چرکا کھا جاؤ گے تو اماں جان روتی پھریں گی۔

نواب:۔ مردود۔ اب تیری بدزبانیاں حد کو پہنچ گئی ہیں۔ دیکھ اب تجھے تیری گستاخی کی سزا دیتا ہوں۔

یہ کہتے ہی کہتے نواب نے دلائی کے اندر سے ہاتھ نکالا۔ ہاتھ میں تمنچہ تھا۔ دن سے داغ دیا۔ خاں صاحب دھم سے گر پڑے۔ میں سن سے ہوگئی۔ فرش پر خون ہی خون نظر آتا تھا۔ بوا حسینی جہاں کھڑی تھیں کھڑی رہ گئیں۔ تمنچہ کی آواز سن کے خانم صاحب، مرزا صاحب، میر صاحب، خورشید، امیر جان، بسم اللہ جان، خدمت گار، مہریاں، تو، میں، سب دوڑے آئے۔ میرے کمرے میں بھیڑ ہوگئی۔ سب اپنی اپنی کہنے لگے۔ اتنے میں شمشیر خاں (ایک ادھیڑ سا آدمی، نواب صاحب کا ملازم) نے لپک کے نواب کے ہاتھ سے تمنچہ لیا اور کہا۔

شمشیر خاں:۔ لے حضور اب گھر تشریف لے جائیں میں سمجھ لوں گا۔

نواب:۔ میں نہیں جاتا۔ اب جو ہوا اور جو کچھ ہونا ہوگا ہو جائے گا۔

شمشیر خاں:۔ (کمر سے چھری نکال کے) جناب امیر علیہ السلام کی قسم ابھی اپنے کلیجہ میں مارلوں گا نہیں تو برائے خدا آپ چلے جائیے۔ آپ کا یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں ہے۔

اتنے میں لوگوں نے دیکھا، خاں صاحب کے گولی کہاں لگی ہے۔ معلوم ہوا کہ جان کی خیریت ہے۔ بازو میں گولی لگی تھی۔

شمشیر خان:۔ میں عرض کرتا ہوں کہ حضور تشریف لے جائیں۔ اس مردود کا ہوا ہی کیا ہے آپ کیوں بدنام ہوتے ہیں۔

بارے نواب صاحب بھی کچھ سمجھ کے اٹھے۔ ایک آدمی ہمارے یہاں سے

ساتھ کیا گیا۔ گھر تشریف لے گئے۔ خانم نے اسی وقت مرزا علی رضا بیگ کو بلوا بھیجا۔ وہ چوک ہی میں تھے فوراً چلے آئے۔ خانم نے علیحدہ لے جا کر نہیں معلوم کیا کان میں پھونکا۔ وہاں سے آئے تو یہ کہتے ہوئے آئے۔

مرزا:۔ ہو گا پھینک دو مردود کو کمرے کے نیچے، سمجھ لیا جائے گا۔

خیر خاں صاحب کو کمرے کے نیچے تو نہیں پھینکا گیا۔ بازو پر پٹی باندھی، ڈولی بلوائی گئی۔ خاں صاحب کو بھی کسی قدر ہوش آ گیا تھا۔ مکان کا پتہ پوچھا۔ معلوم ہوا مرغ خانہ میں رہتے ہیں۔ ڈولی پر بٹھا کے ان کے گھر بھجوا دیا۔ کہاروں کو سمجھا دیا تھا۔ مکان کے قریب کہیں اتار کے چلے آنا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

سلطان صاحب کئی دن تک نہیں آئے نہ ان کا آدمی آیا۔ مجھے ان سے محبت سی ہو گئی تھی یقین تھا کہ وہ اب نہیں آئیں گے اور واقعی ایسا تھا بھی۔ وضعدار آدمی تھے۔ پہلے ہی جب وہ آئے تھے آدمی کی زبانی پیشتر بہت تاکید تخلیے کے لیے کر دی تھی۔ بوا حسینی نے اقرار کر لیا تھا کہ کوئی نہ آنے پائے گا مگر اتنی چوک ہو گئی کہ دروازے پر کسی کو نہ بٹھا دیا۔ خاں صاحب از غیبی ڈھیلا خدا جانے کہاں سے آن پڑے سارا کھیل بگڑ گیا۔ اتفاق سے پانچ چار دن کے بعد ایک برات میں میرا مجرا آ گیا تھا۔ وہاں سلطان صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ میرا پہلا مجرا نو بجے رات کو شروع ہوا تھا۔ محفل میں بات کرنا کیسا، اشارے کنایے کا بھی موقع نہ تھا۔ ایک لڑکا گورا گورا کوئی نو برس کا سن بھاری کپڑے پہنے سلطان صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ کسی ضرورت سے اٹھا میرا مجرا ہو چکا تھا علیحدہ کمرے میں پیشواز اتار رہی تھی۔ میں نے اسے اشارے سے بلایا، پاس بٹھایا ایک پان لگا کے دیا، پوچھا۔

میں:۔ سلطان صاحب کو جانتے ہو؟

لڑکا:۔ کون سلطان صاحب؟

میں:۔ وہ جو دولھا کے برابر تمھارے پاس بیٹھے تھے۔

لڑکا:۔ (تیورے چڑھا کے) واہ وہ ہمارے بڑے بھائی ہیں، انھیں ذرا سلطان صاحب نہ کہنا۔

میں:۔اچھا تو ہم کچھ دیں انھیں دے دو گے۔

لڑکا:۔کہیں مجھ پر خفا نہ ہوں۔

میں:۔خفا نہیں ہوں گے۔

لڑکا:۔اور دو گی کیا، پان؟

میں:۔پان نہیں، پان تو ان کے خاصدان میں ہوں گے۔اے لو یہ کاغذ دے دینا۔ ایک پرچہ کاغذ کا کمرے میں فرش پر پڑا تھا میں نے اس پر کوئلے سے یہ شعر لکھ دیا۔

مدتوں سے ہم ہیں محروم عتاب

بزم میں آج ان کو چھیڑا چاہیے

اور سمجھا دیا کہ یہ کاغذ ان کی آنکھ بچا کے سامنے رکھ دینا۔ان کو معلوم بھی نہ ہوگا۔لڑکے نے ایسا ہی کیا۔میں کمرے کی پٹ کی آڑ سے جھانک رہی تھی۔سلطان صاحب نے وہ کاغذ اٹھایا۔پڑھا تو پہلے چہرے پر کچھ فکر کے آثار ظاہر ہوئے پھر تھوڑی دیر تک غور سے پرچے کو دیکھتے رہے اس کے بعد مسکرا کے جیب میں رکھ لیا۔

شمشیر خاں کو اشارے سے بلایا۔اس کے کان میں کچھ چپکے سے کہا گھنٹہ بھر کے بعد شمشیر خان ہمارے کمرے میں آیا۔

شمشیر خاں:۔نواب صاحب نے کہا ہے کہ اس پرچے کا جواب ہم گھر پر جا کر لکھ بھیجیں گے۔

دوسرا مجرا صبح کو ہوا تھا اس وقت سلطان صاحب محفل میں نہ تھے۔ان کے بغیر محفل مجھے سونی معلوم ہوتی تھی۔گانے میں دل نہ لگتا تھا۔آخر جوں توں مجرا ختم ہوا۔میں گھر پر آئی اس دن دن بھر شمشیر خاں کا انتظار رہا۔بارے چراغ جلنے کے بعد وہ آیا۔نواب کا رقعہ دیا۔مضمون یہ تھا۔

تمہارے شعر نے اس آگ کو جو میرے دل میں دبی ہوئی تھی کرید کر بھڑ کا دیا۔ واقعی مجھے تم سے محبت ہے مگر اپنی وضع سے مجبور ہوں۔ تمہارے مکان پر اب ہر گز نہ آؤں گا۔ میرے ایک بے تکلف دوست نواز گنج میں رہتے ہیں کل میں تمھیں وہاں بلوا بھیجوں گا۔ بشرطِ فرصت چلی آنا۔ یہی ایک صورت ملنے کی ہے وہ بھی نو دس بجے رات تک۔

شبِ وصال کی کوتاہیوں کا شکوہ کیا
یہاں تو ایک نظر دیکھنے کے لالے ہیں

سلطان صاحب اس دن سے کبھی خانم کے مکان پر نہیں آئے۔ ہفتہ میں دو تین مرتبہ نواز گنج میں نواب بنّے صاحب کے مکان پر بلوا بھیجتے تھے۔ عجب لطف کی صحبت رہتی تھی۔ کبھی شعر وسخن کا چرچا ہوا۔ کبھی نواب بنّے صاحب طبلہ بجانے لگے میں گانے لگی۔ سلطان صاحب خود بھی گاتے تھے۔ تال سم سے تو کچھ ایسے واقف نہ تھے مگر اپنی غزل آپ خود گا لیتے تھے۔

کچھ اس طرح سے نظر بازیوں کی مشق بڑھی
میں ان کو اور وہ میری نظر کو دیکھتے ہیں

جب یاد آتا ہے، اُس جلسہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ گرمیوں کے دن، شبِ مہتاب کا عالم، صحنِ باغ میں تختوں کے چوکے پر سفید چاندنی کا فرش ہے، گاو تکیے لگے ہوئے، سامانِ عیش ونشاط مہیا، باغ میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے، بیلے چمبیلی کی مہک سے دماغ معطر، خوشبودار گلوریاں، لبسے ہوئے حقے، تخلیے کا جلسہ، آپس کی چہلیں، بے تکلفی کی باتیں۔

ایسے ہی جلسوں میں بیٹھ کر دنیا و مافیہا کا تو ذکر کیا، انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے اور اس کی سزا ہے کہ ایسے جلسے بہت ہی جلد برہم ہو جاتے ہیں اور ان کا افسوس مرتے دم تک رہتا ہے بلکہ شاید مرنے کے بعد بھی۔

لذتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

واقعی سلطان صاحب کو مجھ سے اور مجھے اُن سے محبت تھی۔ دونوں کے مذاق کچھ ایسے ملتے ہوئے تھے کہ اگر عمر بھر کا ساتھ ہوتا تو کبھی ملال نہ ہوتا۔ سلطان صاحب کو شعر و سخن کا شوق تھا اور مجھے بھی بچپن سے اس کی لت ہے۔ سلطان صاحب سے جیسا میرا دل ملا اور کسی سے نہیں ملا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اسی سبب سے محبت کرتے تھے۔ بات بات میں شعر پڑھتے تھے۔ میں جواب دیتی تھی۔ مگر افسوس فلکِ تفرقہ انداز نے وہ جلسہ بہت ہی جلد ختم کر دیا۔

دل یہ کہتا ہے فراقِ ماہ و انجم دیکھ کر
ہائے کیا کیا صحبتیں راتوں کو برہم ہو گئیں

رسوا: اچھا وہ تو سب کچھ ہوا آپ کے قدم کی برکت سے ایسے ایسے بہت سے جلسے برہم ہو گئے ہوں گے۔

امراو:۔ واہ مرزا صاحب! تو کیا میرے دشمن بھن پیرے تھیں؟ یہ آپ نے خوب کہی۔

رسوا:۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا مگر سلامتی سے جہاں آپ تشریف لے گئیں صفائی ہو گئی۔

امراو:۔ آپ جو چاہے کہیے۔ اگر ایسا جانتی کہ آپ یہ کہیں گے تو اپنی روداد ہرگز نہ بیان کرتی۔ خیر اب قصور ہوا۔

رسوا:۔ قصور! یہی تو آپ نے زندگی بھر میں ایک کام کیا جس سے آپ کا نام دنیا میں رہ جائے گا۔ خواہ نیک نامی کے ساتھ، خواہ بدنامی کے ساتھ۔ اس کا میں ذمہ نہیں کرتا۔ اب اس بات کو یہیں تک رہنے دیجیے۔ ذرا اس غزل کے دو تین شعر اور یاد ہوں تو پڑھ دیجیے۔

امراؤ:۔آپ بھی آدمی کو خوب بناتے ہیں۔

رسوا:۔خیر۔بگاڑتا نہیں۔اچھا اب شعر پڑھیے۔

امراؤ:۔اچھا سنیے۔ایک مطلع اور دو شعر اور یاد ہیں۔

دَردِ دل کی لذتیں صرفِ شبِ غم ہوگئیں
طولِ فرقت سے بہت بے تابیاں کم ہوگئیں

وہ جو بیٹھے سوگ میں زلفِ رسا کھولے ہوئے
حسرتیں میری شریکِ بزمِ ماتم ہوگئیں

ہم نشیں دیکھی نحوست داستانِ ہجر کی
صحبتیں جمنے نہ پائی تھیں کہ برہم ہوگئیں۔

اسی زمانے میں نواب جعفر علی خاں صاحب کی ملاز ہوئی۔سن شریف کوئی ستر برس کے قریب تھا۔منھ میں ایک دانت نہ تھا۔پشت خم ہوگئی تھی۔سر میں ایک بال سیاہ نہ تھا مگر اب تک اپنے کو پیار کرنے کے لائق سمجھتے تھے۔ہائے وہ ان کا کیچلی کا انگرکھا اور گلبدن کا پاجامہ، لال نیفہ، مصالحہ دار ٹوپی، کاکلیں بنی ہوئی، عمر بھر نہ بھولیں گے۔

آپ کہیے گا۔اس عمر اور ایسی حالت میں رنڈی نوکر رکھنا کیا ضرور تھا؟ سنیے مرزا صاحب! اس زمانے کا فیشن یہی تھا۔کوئی امیر رئیس ایسا بھی ہوگا جس کے پاس رنڈی نہ ہو۔نواب صاحب کے سرکار میں جہاں اور سامان شان وشوکت کے تھے وہاں سلامتی منانے کے لیے جلوسیوں میں ایک رنڈی کا بھی اسم تھا، پچھتّر روپیہ ماہوار ملتے تھے۔دو گھنٹہ کے لیے مصاحبت کرکے چلی آتی۔اور تکلف سنیے۔نواب بوڑھے ہوگئے تھے مگر کیا مجال کہ نو بجے بعد دیوان خانے میں بیٹھ سکیں۔اگر کسی دن اتفاق سے دیر ہوگئی کھلائی[1] آکے زبردستی اٹھالے جاتی تھی۔نواب صاحب کی والدہ

زندہ تھیں اُن سے اسی طرح ڈرتے تھے جس طرح پانچ برس کا بچہ ڈرتا ہے۔ بیوی سے بھی انتہا کی محبت تھی۔ بچپن میں شادی ہوئی تھی مگر سوائے عشرہ محرم کی شبوں کے کسی دن علیحدہ سونے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔

آپ تو ہنستے ہوں گے مگر میرے دل سے پوچھیے۔ بے شک پیار کرنے کے قابل تھے۔اس بڑھاپے میں جس وقت سوز پڑھتے تھے، دل لوٹ جاتا تھا۔

فن موسیقی میں ان کو کمال تھا۔ کیا مجال کوئی ان کے سامنے گا سکے۔ اچھے اچھے گویّوں کو ٹوک دیا۔ سوز خوانی میں یکتا تھے۔ سندی لسوز میر علی صاحب کے ان کو پہنچے ہوئے تھے۔ان کی ملازمت سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ سیکڑوں سوز یاد ہو گئے۔ دور دور میری شہرت ہوگئی۔

خانم کی تعزیہ داری تمام شہر کی رنڈیوں سے بڑھ چڑھ کے تھی۔ امام باڑہ میں جھلکے۔ شیشہ آلات جوڑے نادر تھی۔ عشرہ محرم دس تک روز مجلس ہوتی تھی۔ عاشورے کے دن سیکڑوں محتاج مومنین کی فاقہ کشائی جاتی تھی۔ چہلم تک ہر جمعرات کو مجلس ہوتی تھی۔

میری سوز خوانی مشہور تھی۔ ایسی ترکیبیں اور کسی کو کب یاد تھیں۔ بڑے بڑے سوز خوان میرے سامنے منھ نہ کھول سکتے تھے۔اِسی سوز خوانی کی بدولت نواب ملکۂ کشور کے محل تک میری رسائی ہوئی۔ جہاں پناہ نے خود میری نوحہ خوانی کی تعریف کی۔ سرکار شاہی سے مجھ کو بہت کچھ ہر محرم میں عطا ہوتا تھا۔

مرثیہ خوانوں میں میرا اسم تھا۔ شب کو امام باڑہ میں ماتم کر کے مجھے درِ دولت پر حاضر ہونا پڑتا تھا۔ کوئی دو بجے رات کو وہاں سے آتی تھی۔

جس زمانے میں بسم اللہ کی مسّی ہوئی تھی۔ نواب چھبن صاحب کے چچا کربلائے معلیٰ گئے ہوئے تھے۔ بسم اللہ کی مسّی کو کوئی چھ مہینے گزرے ہوں گے کہ وہ کربلا سے تشریف لائے۔ ان کی لڑکی کی نواب کے ساتھ منگنی ہو گئی تھی۔ انھوں نے

آتے کے ساتھ ہی شادی پر زور دیا۔نواب صاحب بسم اللہ جان پر مرتے تھے۔ ادھر بسم اللہ جان کو گھر میں بیٹھ جانے کا فقرہ دے رکھا تھا۔صاف انکار کر دیا مگر انکار چلتا کب تھا۔شاہی زمانہ۔ان کی لڑکی پر گالی چڑھ چکی تھی وہ کب مانتے تھے۔ایک شب کو نواب کے مکان پر جلسہ ہے۔مصاحبین جمع ہیں۔بسم اللہ نواب کے پہلو میں بیٹھی ہے۔اس رات کو بسم اللہ کے ساتھ میں بھی چلی گئی تھی۔

سامنے بیٹھی گا رہی ہوں،نواب صاحب تنبورہ چھیڑ رہے ہیں۔نواب کے ایک مصاحب خاص دلبر حسین طبلہ بجا رہے ہیں۔اتنے میں ایک خبر دار نے خبر دی کہ بڑے نواب صاحب (نواب صاحب کے چچا) تشریف لاتے ہیں۔نواب صاحب یہ سمجھے کہ آئے ہیں تو اندر محل میں بیگم صاحب (نواب صاحب کی والدہ) کے پاس جائیں گے۔ہم سب کو بھی یہی خیال تھا مگر وہ درّانہ دیوان خانہ میں گھسے۔ چلے آئے۔آکے جو دیکھا تو یہ جلسہ ہے،آگ بگولہ ہو گئے۔خیر ان کے آنے کے ساتھ ہی گانا تو موقوف ہوا۔نواب صاحب اٹھ کر کھڑے ہوئے۔

بڑے نواب:۔خیر اب تعظیم وتکریم رہنے دیجیے مجھے ایک امر ضروری عرض کرنا ہے ورنہ آپ کے عیش میں خلل انداز نہ ہوتا۔

نواب:۔ارشاد

بڑے نواب:۔آپ بچے ہیں۔آپ کو معلوم نہیں میرے چھوٹے بھائی نواب احمد علی خان مرحوم نے والدہ مرحومہ کے سامنے انتقال کیا تھا۔اس وجہ سے آپ محجوب الارث ہیں۔کوئی حق آپ کا اس جایداد میں نہیں ہے جس پر آپ قابض اور متصرف

ہیں۔بے شک والدہ مرحومہ نے آپ کو بیٹا کہا تھا اور مرتے وقت آپ کے نام کی وصیت بھی کر گئی ہیں مگر وہ کوئی چیز نہیں صرف ایک ثلث جایداد بنا بر اس وصیت نامہ کے آپ کو مل سکتی ہے لوگوں کے کہنے سننے سے،ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک ثلث سے زیادہ صرف کر چکے ہیں۔خیر ثلث کا مجھے دعویٰ نہیں اور زیادہ کی آپ سے باز

پرس نہ کی جائے گی اس لیے کہ آپ میرے خونِ جگر ہیں۔ (اس کے بعد بڑے نواب صاحب آبدیدہ ہو گئے مگر پھر ضبط کر کے) آپ اس جایداد پر مدت العمر قابض ومتصرف رہتے۔ میری ذاتی جایداد کے بھی آپ ہی وارث ہوتے مگر آپ کی بدوضعی نے مجھ کو مجبور کیا کہ آپ کو اس جایداد موروثی سے بے دخل کر دوں۔ بزرگوں کی نیک کمائی حرام کاری میں مٹانے کے لیے نہیں ہے۔ منصف الدولہ کے آدمی میرے ہمراہ ہیں۔ اس وقت تمام گھر کا تعلیقہ[2] ہو گا۔ آپ فوراً مع اربابِ نشاط یہاں سے تشریف لے جایئے۔

نواب:۔ تو اس جایداد میں میرا کوئی حق نہیں؟

بڑے نواب:۔ جی نہیں۔

نواب:۔ اچھا ایک ثلث پانے کا مستحق ہوں؟

بڑے نواب:۔ وہ آپ لے چکے اور اگر آپ کو کچھ دعویٰ ہے تو درِ عدالت پر تشریف لے جایئے۔ میرے نزدیک آپ کا ایک حبہ نہیں۔

نواب:۔ تو اچھا اماں جان کو میں اپنے ساتھ لیتا جاؤں گا۔

بڑے نواب:۔ وہ آپ سے دست بردار ہوتی ہیں وہ میرے ساتھ کربلا جائینگی۔

نواب:۔ تو اچھا میں کہاں جاؤں؟

بڑے نواب:۔ یہ میں کیا جانوں۔ یہ اپنے مصاحبین اور ملازمین اور معشوقہ سے دریافت کیجیے۔

نواب:۔ اچھا تو میرے کپڑے اسباب وغیرہ تو دید یجیے۔

بڑے نواب:۔ اس مکان میں آپ کا کوئی اسباب نہیں ہے۔ نہ آپ کے ذاتی بنوائے ہوئے کپڑے ہیں۔

اس کے بعد منصف الدولہ کے آدمی دیوان خانے میں چلے آئے۔ نواب صاحب کو مع مصاحبین وارباب نشاط گھر سے باہر کیا۔

ہم لوگوں نے گھر سے نکلتے ہی ڈولیاں کرایہ پر کیں، چوک کا راستہ لیا۔

مصاحبین اور نواب صاحب خدا جانے کہاں گئے؟

سنا ہے کہ مصاحبین ایک ایک کر کے راستے ہی سے رخصت ہو گئے۔ نواب کے والدہ کا ایک قدیم ملازم مخدوم بخش جس کو نواب صاحب نے بیکار سمجھ کر نوکری سے برطرف کر دیا تھا، راستہ میں ملا۔ اس نے حال دریافت کیا ان کی بےکسی پر ترس کھا کے اپنے گھر لے گیا۔

نواب صاحب کے گھر سے آنے کے بعد شب کو بسم اللہ کے کمرے میں جلسہ ہے۔ میاں حسنو، نواب صاحب کے خاص کارکن مصاحب دوست جان نثار جہاں نواب صاحب کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے والے تشریف رکھتے ہیں۔ آج ہی کچھ نہیں آئے ہیں پہلے بھی نواب کے چوری چھپے آیا کرتے تھے۔ مگر آج کھلے خزانے بڑے ٹھاٹ سے بیٹھے ہیں۔ اس وقت آپ بسم اللہ جان پر گویا بے شرکت واحدے و بے مزاحمت غیرے قابض و متصرف ہیں۔ نوکری کی گفتگو ہو رہی ہے۔

حسنو:۔ دیکھو بسم اللہ جان! نواب سے تو اب کوئی امید نہ رکھو، میں جو کچھ کہو وہ دے دیا کروں۔ غریب آدمی ہوں زیادہ تو میری اوقات نہیں۔ جو نواب صاحب دیتے تھے اس کا نصف بھی ممکن نہیں ہیں مگر ہاں کسی نہ کسی طرح آپ کو خوش رکھوں گا۔

بسم اللہ:۔ غریب آدمی ہو، یہ نہیں کہتے کہ نواب کی دولت کاٹ کر گھر میں بھر لی اور پھر ہم سے غریبی بیان ہوتی ہے۔ ایسے غریبوں کو تاولتو نو من چربی سے کم نہ نکلے۔

حسنو:۔ ہیں۔ ہیں تم تو ایسا نہ کہو وہ نواب کے پاس تھا ہی کیا جو میں گھر میں بھر لیتا۔ کیا میری والدہ صاحبہ کے پاس کچھ کم تھا۔

بسم اللہ:۔ آپ کی والدہ صاحبہ فرخندہ نواب سرفراز محل کی خاصہ[21] والیوں میں تھیں نہ؟

میر حسنو:۔(جھینپ کر) وہ جو کوئی ہوں جب مری ہیں تو کوئی چار ہزار کا زیور چھوڑ کے مری ہیں۔

بسم اللہ:۔وہ آپ کی بیوی لے یار کے ساتھ نکل گئیں۔آپ کے پلّے میں کیا پڑا؟ میرے آگے ذرا شیخی نہ بگھاریے، مجھے رتی رتی آپ کا حال معلوم ہے۔

حسنو:۔تو کیا والد کے پاس کچھ کم تھا۔

بسم اللہ:۔والد آپ کے نواب حسن علی خاں کے چڑی ماروں میں تھے۔

حسنو:۔چڑی ماروں میں؟

بسم اللہ:۔اچھا وہ مرغ بازوں میں سہی۔

حسنو:۔مرغ بازوں میں تھے؟

بسم اللہ:۔اچھا وہ بٹیر باز سہی۔تھا تو چڑی مار کا کام۔

حسنو:۔لیجیے آپ تو مذاق کرتی ہیں۔

بسم اللہ:۔میں کھری کہتی ہوں اسی سے بری مشہور ہوں اور کہتی بھی نہ تمھارے چھچھورے پن پر جی جل گیا۔یوں تم آتے تھے۔میں نے کبھی منع نہیں کیا۔آج ہی تو نواب پر یہ واردات گزری، آج ہی آپ نے میرے منھ در منھ نوکری کا پیغام دیا۔ ہوش کی دوا کرو۔تم کیا نوکر رکھو گے، یہی نہ ایک مہینہ دو مہینہ تین مہینے سہی۔

حسنو:۔چھ مہینے کی تنخواہ جمع کر دوں؟

بسم اللہ:۔زبان سے۔

حسنو:۔یہ لو۔(سونے سے جڑاؤ کڑے کمر سے نکال کے) تمہارے نزدیک کتنے کا مال ہوگا؟

بسم اللہ:۔میں دیکھوں (کڑے حسنو کے ہاتھ سے لے کے اپنے ہاتھوں میں پہن لیے) کل چھنا مل کے لڑکے کو دکھاؤں گی مگر بنے اچھے ہیں۔اچھا آپ تشریف لے جائیے اِس وقت تو مجھے چھٹن باجی نے بلا بھیجا ہے ٹھہر نہیں سکتی۔کل اسی وقت آیئے

گا۔

حسنو:۔تو کڑے اتار دیجیے۔

بسم اللہ:۔ یا اللہ! کوئی چوروں سے بھوار لے ہے۔ میں تمھارے کڑے کچھ کھا نہ لوں گی۔اس وقت میرے ہاتھ میں سادی ٹپریاں پڑی ہوئی ہیں۔امّاں جان سے چھپ کے جاتی ہوں۔ان سے کڑے مانگوں گی تو کہیں گی کیا کرو گی۔اس لیے ذرا ہاتھ میں ڈال لیے صبح کو لے جانا۔

حسنو:۔کڑے دید یجیے میرے نہیں ہیں۔نہیں تو کیا بات تھی تم پر سے صدقے کیے تھے۔

بسم اللہ:۔تو کیا آپ کی اماں کے ہیں۔انھوں نے انتقال کیا پھر بھی آپ کا مال نہیں۔

حسنو:۔میں نے یوں ہی تمھیں دکھائے تھے،میرا مال نہیں۔

بسم اللہ:۔جیسے میں پہچانتی نہیں، یہ وہی کڑے ہیں جو نواب نے اس دن میرے سامنے گروی کو دیے تھے۔

حسنو:۔لو اور سنو،یہ کب؟

بسم اللہ:۔یہ جب کہ جس دن بہن امراو کے مجرے کے فرمایش ہوئی تھی۔بہن امراو نے ضد کی کہ پورے سو لوں گی۔نواب کے پاس خرچ نہ تھا۔میرے سامنے صندوقچے سے نکال کے کڑے پھینک دیے تھے (پھر میری طرف مخاطب ہو کے دیکھا) بہن امراو یہ وہی کڑے ہیں نہ؟

میں:۔مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔کیا تم جھوٹ کہو گی۔

بسم اللہ:۔لے خشکا کھائیے۔اب یہ کڑے آپ کو نہ دیئے جائیں گے۔نواب کے کڑے ہیں ہم نے پہچانے اب ہم نہ دیں گے۔

حسنو:۔لو اچھی کہی اور وہ روپے جو ہم نے دیے ہیں؟

بسم اللہ:۔روپے تم کہاں سے لائے وہ بھی نواب کا مال تھا۔

حسنو:۔جی سچ۔مہاجن سے بیازونہ(سودی)لاکے دیے تھے۔

بسم اللہ:۔اچھاتو مہاجن کو بھیج دیجیے ہم اس کو روپے دیدیں گے آپ ٹہلیے۔

حسنو:۔کڑے تو میں لے کر جاؤں گا۔

بسم اللہ:۔میں تو نہ دوں گی۔

حسنو:۔تو کچھ زبردستی ہے۔

بسم اللہ:۔جی ہاں!زبردستی ہے۔لے اب چپکے سے کھسک جایئے نہیں تو......

حسنو:۔اچھاتو رہنے دیجیے،کل ہی دید یجیے گا۔

بسم اللہ:۔کل دیکھا جائے گا۔دیکھا جائے گا۔بسم اللہ نے اِس تیور سے کہا کہ میاں حسنو کو چپکے سے اٹھ کے چلے جانا ہی پڑا۔

بات یہ تھی کہ نواب صاحب کے چچا نے چھبن صاحب کے نوکروں سے حساب فہمی کی ہے۔اس وقت جس قدر اسباب جس جس کے معرفت تھا اس کو سود اور اصل کے روپے دے کے چھڑا لیا۔حسنو سے جب اِس کڑے کی جوڑی کے لیے باز پرس ہوئی تو صاف مکر گیا کہ میری معرفت گروی نہیں ہوئے۔

اسی سے میاں حسنو کی کوردبی تھی۔

بسم اللہ:۔(حسنو کے چلے جانے کے بعد مجھ سے)دیکھا بہن یہ بڑا قابو چی ہے،

نواب کا گھر اسی موذی نے تہس نہس کیا۔میں مدت سے اس موے کی تاک میں تھی۔آج ہی تو داوں پر چڑھا ہے۔یہ کڑے میں اِس کو کب دیتی ہوں۔کر ہی کیا سکتا ہے چوری کا تو مال ہے۔

میں:۔ہرگز نہ دینا۔دینا ہے تو نواب کو دے دو،احسان ہوگا۔

بسم اللہ:۔نواب کو بھی نہ دونگی۔بہن گیارہ سو کی جوڑی ہے۔موے نے سوا دوسو روپے پر ہتھیالی تھی۔زیادہ بریں نیست لکھوا دوسو حوالے کردوں گی دس بیس سود کے

تھی۔

میں:۔بھلا مہاجن یوں کیوں دینے لگا۔

بسم اللہ:۔مہاجن! اسی نے روپے دیے تھے اور جب بڑے نواب نے پوچھا تو کیسا مکر گیا۔اگر یہ کچھ زیادہ ٹر پھس کریں گے تو اس کو کوتوالی کا چبوترا دکھاؤں گی۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ نواب صاحب تشریف لائے۔پا پیادہ، اکیلے، چہرے پر اداسی چھائی ہوئی، آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے، نہ وہ شان نہ وہ شوکت، نہ وہ رعب وداب، نہ بے تکلفی۔چپکے سے آئے بیٹھ رہے۔

سچ کہوں میری تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے مگر میں نے اپنے کو روکا۔مگر واہ ری بسم اللہ، رنڈی ہو تو ایسی ہو۔آتے کے ساتھ ہی کڑوں کا قصہ چھیڑ دیا۔

بسم اللہ:۔نواب دیکھو یہ وہی کڑے کے جوڑی ہے نا جو تم نے اُس دن حسنو کو گروی کرنے کو دی تھی۔

نواب:۔وہی ہیں۔وہ تو مکر گیا تھا کہ میرے ہاتھوں گروی نہیں ہوئے۔

بسم اللہ:۔کتنے پر گروی ہوئے تھے؟

نواب:۔یہ تو یاد نہیں شاید ڈھائی سو یا دو سو کچھ ایسے ہی تھے۔

بسم اللہ:۔اور سود کیا تھا؟

نواب:۔سود کا حساب آج تک کس نے کیا۔جو چیز گروی ہوئی پھر اُس کے چھڑانے کی نوبت کبھی نہیں آئی جو سود کا حساب کیا جاتا۔

بسم اللہ:۔اچھا تو یہ کڑے میں لے لوں؟

نواب:۔لے لو۔

بسم اللہ:۔کہو تو میاں حسنو کو مرزا صاحب کے پاس بھیجوں؟

نواب:۔نہیں۔میرے سر کی قسم ایسا نہ کرنا، سیّد ہے۔

بسم اللہ:۔سیّد ہے۔اِس کے باپ کا تو پتہ نہیں۔

نواب:۔خیر۔وہ تو اپنے منہ سے کہتا ہے۔

میں اپنے دل میں نواب کی ہمت پر آفریں کرنے لگی۔واہ ری ہمت کیا کہنا؟ خاندانی رئیس ہیں نہ۔

بسم اللہ کی بے مروتی دیکھیے۔نواب سے وہی چھٹن جان کے گھر جانے کا بہانہ کر کے ان کو سویرے سے رخصت کر دیا۔خدا جانے کس سے وعدہ تھا۔

اس واقعہ کے دوسرے تیسرے دن کا ذکر ہے میں خانم صاحب کے پاس بیٹھی ہوئی ہوں۔اتنے میں ایک بوڑھی سی عورت آئی۔خانم صاحب کو جُھک جُھک کے سلام کیا۔خانم نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔سامنے بیٹھ گئی۔

خانم:۔کہاں سے آئی ہو؟

بڑھیا:۔کیا بتاؤں کہاں سے آئی ہوں،کوئی ہے تو نہیں۔کیوں؟........

خانم:۔بوا یہاں کون ہے؟ میں ہوں تم ہو اور یہ چھوکری۔اس کو بات سمجھنے کی تمیز نہیں۔کہو۔

بڑھیا:۔مجھے نواب فخر النساء بیگم صاحبہ نے بھیجا ہے۔

خانم:۔کون فخر النسا بیگم صاحبہ؟

بڑھیا:۔اے تو تم نہیں جانتیں نواب چھبن صاحب......

خانم:۔سمجھی،کہو۔

بڑھیا:۔بیگم صاحب نے مجھے بھیجا ہے۔آپ بسم اللہ جان کی اماں ہیں نہ؟

خانم:۔ہاں،بات کہو۔

بڑھیا:۔بیگم صاحب نے کہا ہے کہ چھبن صاحب میرا اکلوتا لڑکا ہے۔میں بھی اس پر پروانہ وار ہوں اور اس کا باپ بھی پروانہ تھا۔میرے نازوں کا پالا ہے اور اس کا چچا بھی دشمن نہیں ہے۔اپنی اولاد سے بڑھ کر سمجھتا ہے،اس کی بھی ایک اکلوتی لڑکی ہے۔چھبن کی منگیتر۔لڑکی پر گالی چڑھ چکی ہے۔چھبن نے شادی سے انکار

کر دیا ہے۔اسی پر چچا کو برا معلوم ہوا۔ میں نے دخل نہیں دیا۔ سب تنبیہ کے لیے کیا گیا ہے۔ تمھاری لڑکی کا عمر بھر کا گھر ہے، جو تنخواہ لڑکا دیتا تھا اُس سے دس اوپر مجھ سے لینا مگر اتنا احسان مجھ پر کرو کہ شادی پر راضی کر دو۔شادی کے بعد سب جایداد اُسی کی ہے۔سوا اس کے اور کون ہے۔میری اور چچا کی جان و مال کا مالک ہے۔مگر اتنا خیال رکھوں کہ یہ گھر تباہ نہ ہونے پائے۔اس میں تمہارا ابھی بھلا ہے اور ہمارا بھی۔آیندہ تم کو اختیار ہے۔

خانم :۔بیگم صاحب کو میری طرف سے آداب تسلیمات کہنا اور عرض کرنا کہ جو آپ نے ارشاد فرمایا ہے خدا چاہے تو وہی ہوگا میں آپ کی عمر بھر کی ہوں، مجھ سے کو،

بڑھیا:۔مگر بیگم صاحب نے کہا ہے کہ چھبن کو اس کی خبر نہ ہونے پائے۔ بڑا ضدی لڑکا ہے اگر کہیں معلوم ہوگا تو ہرگز نہ مانے گا۔

خانم :۔(ماما سے) کیا مجال۔(مجھ سے) دیکھ چھوکری کہیں کسی سے یہ قصہ نہ لے بیٹھنا۔

میں :۔جی نہیں۔

اِس کے بعد بڑھیا نے علیحدہ لے جا کے خانم سے چپکے چپکے باتیں کیں، وہ میں نے نہیں سنا۔ماما کے رخصت کے وقت خانم کو اتنا کہتے سنا۔

خانم :۔میری طرف سے عرض کرنا اس کی کیا ضرورت تھی۔ہم لوگ تو قدیمی نمک خوار ہیں۔

بڑھیا کے جانے کے بعد بسم اللہ کو بلا بھیجا اور کچھ ایسے دو امُچھر[1] کان میں پھونک دیے کہ اب جو نواب صاحب آئے تو وہ آؤ بھگت ہوئی کہ ملازمت کے زمانے میں بھی کبھی نہ ہوئی تھی۔

نواب صاحب بیٹھے ہیں، بسم اللہ سے اختلاط کی باتیں ہو رہی ہیں۔ میں بھی موجود ہوں کہ اتنے میں خانم صاحب بسم اللہ کے کمرے کے دروازے پر جا کے

کھڑی ہوئیں۔

اے لوگو ہم بھی آویں ۔؟

بسم اللہ :۔(نواب سے)ذرا سرک کے بیٹھو اماں آتی ہیں ۔(خانم سے) آیئے ۔

خانم نے سامنے آتے ہی نواب کو تین تسلیمیں کیں۔ میں نے آج کے دن کے سوا خانم کو اِس طرح مؤدب ہو کر سلام کرتے نہ دیکھا تھا۔

خانم :۔(نواب سے) حضور کا مزاج کیسا ہے؟

نواب :۔(گردن جھکا کے) الحمدللہ ۔

خانم :۔خدا خوش رکھے ہم لوگ تو دعا گو ہیں، ہزار بڑھ جائیں مگر پھر بھی وہی ٹکے کی مال زادی۔ آپ کے ہاتھ کے دیکھنے والے۔ آپ کو خدا نے رئیس کیا ہے ۔ اِس وقت ایک عرض لے کے حاضر ہوئی ہوں ۔ یوں تو بسم اللہ خدا رکھے سال بھر سے آپ کے حضور میں ہے مگر میں نے کبھی آپ کو تکلیف نہیں دی بلکہ حضور کے سلام کو بہت کم حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہوگا ۔اِس وقت ایسی ہی ضرورت تھی جو چلی آئی ۔

خانم تو یہ باتیں کر رہی ہیں۔ بسم اللہ ان کا منھ دیکھ رہی ہیں کہ کیا کہہ رہی ہیں ۔میں کسی قدر بات کا پہلو سمجھے ہوئے تھی ۔نواب اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ نواب کا یہ حال ہے کہ چہرے سے ایک رنگ جاتا ہے اور ایک آتا ہے۔ آنکھیں جھینپی جاتی ہیں مگر چپکے بیٹھے ہیں۔

خانم :۔تو پھر عرض کروں؟

نواب :۔(بہت مشکل سے) کہیے۔

خانم :۔ذرا بوا حسینی کو بلا لینا۔

خانم :۔(بوا حسینی سے) بوا ذرا دوشالے کی جوڑی تو اٹھا لانا۔ وہی جو کل بکنے کو آئی ہے۔

’’بکنے کو آئی ہے‘‘ ان لفظوں نے نواب پر وہی اثر کیا جیسے کہ دفعتاً کسی پر بجلی گرے مگر

بہت ضبط کر کے چپکے بیٹھے رہے۔ اتنے میں بوا حسینی دوشالہ لے آئیں۔ کیسا پُر متن زرکار دوشالہ کہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

خانم :۔(نواب کو دوشالہ دکھا کے)

دیکھیے یہ دوشالہ بکنے کو آیا ہے۔ سوداگر دو ہزار کہتا ہے۔ پندرہ سو تک لوگوں نے لگا دیے ہیں۔ وہ نہیں دیتا۔ میری نگاہ میں سترہ بلکہ اٹھارہ تک مہنگا نہیں ہے۔ اگر حضور پرورش کریں تو بھلا اس بڑھاپے میں آپ کی بدولت ایک دوشالہ تو اوڑھ لوں۔

نواب خاموش بیٹھے رہے۔ بسم اللہ کچھ بولا ہی چاہتی تھیں کہ خانم نے نواب سے کہا۔

خانم :۔ٹھہر لڑکی۔ تو ہمارے بیچ میں نہ بولنا۔ تو آئے دن فرمائش کیا کرتی ہے، ایک فرمائش ہماری بھی سہی۔

نواب پھر چپکے بیٹھے ہیں۔

خانم :۔ اوئی نواب! سخی سے سوم بھلا جو جلدی دے جواب۔ کچھ تو ارشاد کیجیے۔ سکوت سے تو بندی کو تسکین نہ ہوگی۔ ہاں نہ سہی نہیں سہی، کچھ تو کہہ دیجیے میرے دل کا ارمان نکل جائے۔

نواب :۔اب بھی چپ ہیں۔

خانم :۔للہ حضور جواب دیجیے۔ یوں تو میری حقیقت ہی کیا ہے۔ موئی بازاری کسبی، مگر آپ ہی لوگوں کی عزت دی ہوئی ہے۔ برائے خدا ان چھوکریوں کے سامنے تو مجھ بڑھیا کو ذلیل نہ کیجیے۔

نواب :۔(آبدیدہ ہو کر) خانم صاحب اِس دوشالے کی کوئی اصل نہیں ہے مگر تم کو شاید میرا حال معلوم نہیں۔ کیا بسم اللہ جان نے کچھ نہیں کہا۔ اور امراؤ جان بھی تو اس دن تھیں۔

خانم:۔ مجھ سے کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ کیوں خیر تو ہے؟

بسم اللہ پھر کچھ بولنے کو تھیں کہ خانم نے آنکھ کا اشارہ کیا، وہ چپ ہو رہیں، ٹال کے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ میں پہلے ہی سے بت بنی بیٹھی تھی۔

نواب:۔ اب ہم اس قابل نہیں رہے جو آپ کی فرمایشوں کو پورا کریں۔

خانم:۔ آپ کے دشمن اس لائق نہ رہے ہوں اور میں ایسی چھچھوری نہیں جو روز فرمایشیں کیا کروں۔ فرمایشیں کریں نہ کریں بسم اللہ کریں۔ بھلا میں بوڑھی آڑھی میری فرمایشیں کیا اور میں کیا۔ یہ کہہ کے خانم نے ایک آہِ سرد بھری۔

خانم:۔ ہائے تقدیر اب ہم اس لائق ہو گئے کہ ایسے ایسے رئیس ایک ذرا سے چیتھڑے کے لیے ہم سے منھ چھپاتے ہیں!

میں دیکھ رہی تھی کہ خانم کا ایک ایک فقرہ نواب کے دل پر نشتر کا کام دے رہا تھا۔

نواب:۔ خانم صاحب آپ سب لائق ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں اب میں اس لائق نہیں رہا جو کسی کی فرمایش پوری کروں۔ اس کے بعد نواب نے اپنی تباہی کا مختصر حال کہا۔

خانم:۔ خیر میاں اس لائق تو آپ نہیں رہے کہ ایک ادنیٰ سی فرمایش پوری کریں تو پھر لونڈی کے مکان پر آنا کیا فرض تھا۔ حضور کو نہیں معلوم کہ بیسوائیں چار پیسے کی میت ہوتی ہیں۔ کیا آپ نے یہ مثل نہیں سنی کہ رنڈی کس کی جورو۔ ہم لوگ مروّت کریں تو کھائیں کیا۔ یوں آیئے، آپ کا گھر ہے، میں منع نہیں کرتی مگر آپ کو اپنی عزّت کا خود ہی خیال چاہیے۔ یہ کہہ کے خانم فوراً کمرے سے چلی گئیں۔

نواب:۔ واقعی مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ اب انشاء اللہ نہ آؤں گا۔

یہ کہہ کے وہ اٹھنے کو تھے کہ بسم اللہ نے دامن پکڑ کے بٹھالیا۔

بسم اللہ:۔ اچھا تو اس کڑے کی جوڑی کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

نواب:۔(کسی قدر ترش ہو کے) میں نہیں جانتا۔

بسم اللہ:۔اے وہ تو تم بالکل ہی خفا ہو گئے۔جاتے کہاں ہو ٹھہرو۔

نواب:۔نہیں بسم اللہ جان اب مجھ کو جانے دو۔اب میرا آنا بے کار ہے۔جب خدا ہمارے دن پھیرے گا تو دیکھا جائے گا اور اب کیا دن پھریں گے۔

نواب:۔میں تو نہ جانے دوں گی۔

نواب:۔تو کیا اپنی ماں سے جوتیاں کھلوؤ گی۔

بسم اللہ:۔(مجھ سے) ہاں سچ تو ہے بہن امراو، آج یہ بڑی بی کو ہوا کیا تھا؟ برسوں ہو گئے میرے کمرے میں آج تک جھانکی نہ تھیں۔آج آئیں بھی تو قیامت برپا کر گئیں۔بھئی اماں جان چاہے خفا ہو جائیں چاہے خوش ہوں میں نواب سے رسم نہیں ترک کر سکتی۔آج نہیں ہے ان کے پاس نہ ہی۔ایسی بھی کیا آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لینی چاہیے۔آخر یہی نواب ہیں جن کی بدولت اماں جان نے ہزاروں روپے پائے۔آج زمانہ ان سے پھر گیا تو کیا ہم بھی توتے کی طرح آنکھیں پھیر لیں، گھر سے نکال دیں؟ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔اب اگر اماں زیادہ تنگ کریں گی تو بہن امراو سچ کہتی ہوں، نواب کا ہاتھ پکڑ کے کسی طرف کو نکل جاؤ گی۔لو میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

میں بسم اللہ کی باتیں بہت اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔

بسم اللہ:۔اچھا تو نواب تم کہاں رہتے ہو؟

نواب:۔کہاں بتاؤں۔

بسم اللہ:۔آخر کہیں تو؟

نواب:۔تحسین گنج میں مخدوم بخش کے مکان پر رہتا ہوں۔افسوس! میں نہ جانتا تھا کہ مخدوم ایسا نمک حلال آدمی ہے۔سچ تو یہ ہے کہ میں اس سے بہت ہی شرمندہ ہوں۔

میں :۔ یہ وہی مخدوم بخش ہیں نا جو آپ کے والد کے وقت سے نوکر تھا۔ جس کو آپ نے موقوف کر دیا تھا۔

نوب :۔ ہاں وہی مخدوم بخش ۔ کیا کہوں اس وقت وہ کیسا کام آیا۔ خیر اگر خدا نے چاہا..... اتنا کہہ کہ نواب کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر پڑے ۔

اس کے بعد نواب بسم اللہ کے ہاتھ سے دامن چھڑا کے کمرے کے باہر چلے گئے ۔ میرا ارادہ تھا کہ نواب سے چلتے وقت کچھ باتیں کروں گی اور اسی لیے ان کے ساتھ اٹھی تھی مگر وہ اس قدر جلد زینے سے اتر گئے کہ میں کچھ نہ کہہ سکی ۔ نواب کے تیور اس وقت بہت برے تھے ۔ خانم کی باتوں نے نواب کے دل پر سخت اثر کیا تھا۔ ان کی حالت بالکل مایوسی کی تھی ۔ اگر چہ مجھے معلوم تھا کہ یہ سب باتیں خانم نے جو کہیں ہیں وہ سب اس فہمایش کی تمہید ہے جو اور کسی وقت پر موقوف رکھی گئی ہے مگر مجھے بہت ہی تشویش تھی کہ دیکھیے کیا ہوتا ہے ۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ کھا کے سو رہیں تو اور غضب ہو ۔

سرِ شام میں اور بسم اللہ دونوں سوار ہو کے تحسین گنج گئے ۔ مخدوم بخش کا مکان بڑی مشکل سے ملا۔ کہاروں نے اس کے دروازے پر آواز دی۔ ایک چھوٹی سی لڑکی اندر سے نکلی ۔ اس سے معلوم ہوا کہ مخدوم بخش گھر پر نہیں ہے۔ نواب کو پوچھا، اس نے کہا کہ وہ صبح سے کہیں گئے ہوئے ہیں ابھی تک نہیں آئے ۔ دو گھنٹہ تک انتظار کیا۔ نہ نواب صاحب آئے نہ مخدوم بخش ۔ آخر مایوس ہو کر گھر چلے آئے ۔

دوسرے دن صبح کو مخدوم بخش نواب کو ڈھونڈھتا ہوا آیا۔ معلوم ہوا کہ رات کو بھی اس کے مکان پر نہیں گئے ۔ شام کو ان کی والدہ کی ماما وہی بڑھیا جو ایک دن خانم کے پاس آئی تھی روتی پیٹتی آئی ۔ اس سے بھی یہی خبر ملی کہ نواب کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ بیگم صاحب نے روتے روتے اپنا عجب حال کیا۔ بڑے نواب سخت متفکر ہیں ۔

اس واقعے کو کئی دن گذر گئے اور نواب چھبن صاحب کا کہیں پتہ نہیں ملا۔ اس واقعے کے چوتھے پانچویں روز چھبن صاحب کی انگوٹھی نخاس میں بکتی ہوئی پکڑی گئی۔ بیچنے والے کو علی رضا بیگ کوتوال کے پاس لے گئے۔ اس نے کہا مجھے امام بخش ساقی کے لڑکے نے بیچنے کو دی ہے۔ امام بخش ساقی کا لڑکا تو نہ ملا خود امام بخش پکڑ کر بلایا گیا۔ پہلے تو امام بخش صاف مکر گیا کہ اس انگوٹھی کو نہیں جانتا۔ آخر جب مرزا نے خوب ڈانٹا اور دھمکایا تو قبول دیا۔

حضور میں اب دریا پر لوہے کے پل کے پاس حقہ پلاتا ہوں۔ جو لوگ دریا نہانے جاتے ہیں اُن کے کپڑوں کی رکھوالی کرتا ہوں۔ پانچ دن کا ذکر ہے ایک شریف زادے کوئی بیس بائیس برس کی عمر ہوگی۔ گورے سے تھے۔ بہت خوبصورت نوجوان تھے۔ سرِ شام پکے پل پر نہانے آئے، کپڑے اتار کے میرے پاس رکھوا دیے۔ مجھ سے لنگی لے کے باندھی۔ خود دریا میں کود پڑے۔ تھوڑی دیر تک نہایا کیے پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے اور سب لوگ دریا سے نہا نہا کے نکلے، کپڑے پہن پہن کر اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے وہ صاحب نہ آئے میں سمجھا کہ کسی طرف پیرتے ہوئے نکل گئے ہوں گے۔ بڑی دیر ہو گئی۔ میں اس آسرے میں کہ اب آتے ہیں اب آتے ہیں۔ پہر رات گئے تک بیٹھا رہا آخر مجھے یقین ہو گیا کہ ڈوب گئے۔ اب دل میں سوچا کہ اگر کسی کو خبر کرتا ہوں تو جھگڑوں میں پھنس جاؤں گا۔ کھنچا کھنچا پھروں گا۔ اس سے بہتر ہے کہ چپ ہو رہوں۔ ان کے کپڑے اٹھا کے گھر لے آیا۔ جیب میں سے یہ انگوٹھی نکلی اور ایک اور انگوٹھی ہے اس میں خدا جانے کیا لکھا ہے۔ میں نے مارے ڈر کے آج تک کسی کو نہیں دکھائی میں تو اس انگوٹھی کو بھی نہیں بیچتا مگر میرا لڑکا شہدا ہو گیا ہے۔ وہ چرا کے لے آیا۔

مرزا علی رضا بیگ نے دو سپاہی کوتوالی سے ساتھ کیے۔ وہ انگوٹھی اور کپڑے اس کے گھر سے منگوائے۔ انگوٹھی مہر کی تھی۔ مرزا علی رضا بیگ نے بڑے نواب

کو اس سانحے کی خبر کی۔ کپڑے اور دونوں انگوٹھیاں گھر بھجوا دیں۔ امام بخش کو سزا ہو گئی۔

بسم اللہ: ۔ ہاہا آخر نواب چھبن صاحب ڈوب گئے نا؟ میں تو سچ کہوں اماں جان کی گردن پر اُن کا خون ہوا۔

میں: ۔ افسوس! میں تو اسی دن دل میں کھٹک گئی تھی ۔ اسی لیے اس دن ان کے ساتھ اٹھی تھی کہ کچھ سمجھا دوں مگر وہ زینے سے اتر ہی گئے۔

بسم اللہ: ۔ ان کے سر پر قضا سوار تھی۔ خدا غارت کرے بڑے نواب کو، نہ ان کو جایداد سے بے حق کرتے نہ وہ اپنی جان دیتے۔

میں: ۔ خدا جانے ماں کا کیا حال ہوا ہوگا؟

بسم اللہ: ۔ سنا ہے، بے چاری دیوانی ہو گئی ہیں۔

میں: ۔ جو نہ ہو کم ہے۔ یہی تو ایک اللہ آمین کا لڑکا تھا۔ ایک تو بے چاری رانڈ بیوہ، دوسرے یہ آفت ان کے سر پر ٹوٹ پڑی۔ سچ پوچھو تو ان کا گھر ہی تباہ ہو گیا۔

رسوا: ۔ تو نواب چھبن صاحب کو آپ نے ڈبو ہی دیا۔ اچھا اس موقع پر ایک بات اور مجھے پوچھ لینے دیجیے۔

امراو: ۔ پوچھیے

رسوا: ۔ نواب صاحب پیرنا جانتے تھے یا نہیں؟

امراو: ۔ کیا معلوم ۔ یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں؟

رسوا: ۔ اس لیے کہ مجھے میر مچھلی صاحب نے ایک نکتہ بتا دیا تھا کہ جو شخص پیرنا جانتا ہے وہ اپنے قصد سے نہیں ڈوب سکتا۔

کچھ اُن کو امتحانِ وفا سے غرض نہ تھی

اک ذرا رونا تو اس کے ستانے سے کام تھا

امراؤ:۔مرزا رسوا صاحب آپ کو کسی سے عشق ہوا ہے؟

رسوا:۔جی نہیں! خدا نہ کرے۔آپ کو تو سیکڑوں سے عشق ہوا ہو گا، آپ اپنا حال کہیے۔ایسی ہی باتیں سننے کے تو ہم مشتاق ہیں مگر آپ کہتی ہی نہیں۔

امراؤ:۔میرا تو رنڈی کا پیشہ ہے اور یہ ہم لوگوں کا چلتا ہوا فقرہ ہے۔جب کسی کو دام میں لانا چاہتے ہیں اس پر مرنے لگتے ہیں۔ہم سے زیادہ کسی کو مرنا نہیں آتا۔ٹھنڈی سانسیں بھرنا، بات بات پر رو دینا، دو دن کھانا نہ کھانا، کنویں میں پیر لٹکا کے بیٹھ جانا، سنکھیا کھا لینا یہ سب کیا جاتا ہے۔کیسا ہی سخت دل آدمی کیوں نہ ہو ہمارے فریب میں آ ہی جاتا ہے مگر آپ سے سچ کہتی ہوں کہ نہ مجھ سے کسی کو عشق ہوا نہ مجھے کسی سے البتہ بسم اللہ جان کو عشق بازی میں بڑا ملکہ تھا۔انسان تو انسان فرشتہ ان کے جعل سے نہیں نکل سکتا تھا۔ہزاروں ان کے عاشق تھے اور وہ ہزاروں پر عاشق تھیں۔سچے عاشقوں میں ایک مولوی صاحب قبلہ کا بھی چہرہ تھا۔ایسے ویسے مولوی نہ تھے۔عربی کی اونچی اونچی کتابوں کا درس دیتے تھے۔دور دور سے لوگ ان سے پڑھنے آتے تھے۔معقولات میں ان کا مثل و نظیر نہ تھا۔جس زمانے کا ذکر کرتی ہوں سن شریف ستر سے کچھ ہی کم ہو گا، نورانی چہرہ، سفید ڈاڑھی، سر منڈا ہوا، اس پر عمامہ، عبائے شریف، عصائے مبارک، ان کی صورت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا آپ ایک چھٹی ہوئی شوخ نوجوان رنڈی پر عاشق ہیں اور اس طرح عاشق ہیں۔

ایک دن کا واقعہ عرض کرتی ہوں، اس میں کسی طرح کا مبالغہ نہ سمجھیے بالکل صحیح صحیح ہے۔آپ کے دوست..... میر صاحب قبلہ مرحوم جن کا دلبر جان سے تعلق تھا۔خود شاعر تھے اور عمدہ اشعار پر دم دیتے تھے۔اسی سلسلہ میں حسن پرستی کا بھی شوق تھا مگر نہایت ہی معقولیت کے ساتھ۔شہر کی وضعدار رنڈیوں میں کون ایسی تھی جہاں وہ نہ جاتے ہوں۔

رسوا:۔ جی ہاں کہیے۔ میں خوب جانتا ہوں خدا اُن کے درجات عالی کرے۔

امراو:۔ وہ بھی اس موقع پر موجود تھے۔ شاید آپ کو یاد ہو۔ بسم اللہ جان، خانم سے لڑ کے کچھ دنوں کے لیے اس مکان میں جا کر رہی تھیں جو بزازے کے پچھواڑے تھا۔

رسوا:۔ میں اس مکان پر کبھی نہیں گیا۔

امراو:۔ خیر۔ میں بسم اللہ کے دیکھنے کے لیے اور اس غرض سے بھی کہ ماں بیٹیوں میں ملاپ کرا دوں، میں اکثر جایا کرتی تھی۔ ایک دن قریب شام صحن میں تختوں کے چوکے پر گاؤ تکیے سے لگی بیٹھی ہیں۔ میر صاحب مرحوم ان قریب تشریف رکھتے ہیں۔ مولوی صاحب قبلہ دوزانو بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس وقت ان کی بے کسی کی صورت مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ زیتون کی تسبیح، چپکے چپکے (شاید) یا حفیظ یا حفیظ پڑھ رہے ہیں۔ میں جو گئی تو بسم اللہ نے ہاتھ پکڑ کے مجھے برابر بٹھالیا۔ میں میر صاحب اور مولوی صاحب کو تسلیم کر کے بیٹھ گئی۔ بسم اللہ نے چپکے سے میرے کان میں کہا۔ تماشہ دیکھو گی؟

میں:۔ (حیران ہو کر) کیا تماشہ؟

بسم اللہ:۔ دیکھو! یہ کہہ کہ مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہوئیں۔

مکان کے صحن میں ایک بہت پرانا نیم کا درخت تھا۔ مولوی صاحب کو حکم ہوا اس درخت پر چڑھ جاؤ۔

مولوی صاحب کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں، تھر تھر کانپنے لگے۔ میں زمیں پر گری پڑی جاتی تھی۔ میر صاحب منھ پھیر کے بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب بے چارے کبھی آسمان کو دیکھتے تھے کبھی بسم اللہ کی صورت کو۔ وہاں ایک حکم کر کے دوسرا حکم پہنچا اور فوراً تیسرا نادری حکم ''چڑھ جاؤ کہتی ہوں۔''

اب میں نے دیکھا کہ مولوی صاحب بسم اللہ کہہ کہ اٹھے۔ عبائے شریف کو

تختوں کے چوکے پر چھوڑا۔نیم کی جڑ کے پاس کھڑے ہوے، پھر ایک مرتبہ بسم اللہ کی طرف دیکھا۔اس نے اک ذرا چیں بجبیں ہو کے کہا۔''ہوں۔''

مولوی صاحب پائجامہ چڑھا کے درخت پر چڑھنے لگے۔تھوڑی دور جا کر بسم اللہ کی طرف دیکھا۔اس دیکھنے کا شاید یہ مطلب تھا کہ بس یا اور؟

بسم اللہ:۔اور۔

مولوی صاحب اور چڑھے پھر انتظار کا حکم کیا۔پھر وہی اور، اسی طرح درخت کی پھننگ کے پاس پہنچ گئے۔اب اگر اوپر جاتے تو شاخیں اس قدر پتلی تھیں کہ ضرور ہی گر پڑتے اور جان بحق تسلیم ہو جاتے۔بسم اللہ کی زبان سے 'اور' نکلنے کو ہی تھا کہ میں قدموں میں گر پڑی۔میر صاحب کی نہایت منت کے ساتھ سفارش کی۔ بارے حکم ہوا اُتر آو۔مولوی صاحب چڑھنے کو تو چڑھ گئے مگر اترنے میں بڑی دقت ہوئی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب گرے اور جب گرے مگر بخیر و عافیت اُتر آے۔ بے چارے پسینے پسینے ہو گئے۔دم پھول گیا۔قریب تھا کہ گر پڑیں مگر اپنے کو سنبھال کے نعلین پہن کے تخت کے قریب آئے۔عبائے مبارک زیب دوش کیا۔چپکے بیٹھ گئے، تسبیح پڑھنے لگے۔بیٹھ تو گئے مگر کسی پہلو قرار نہ تھا۔چیونٹے ازار شریف میں گھس گئے تھے اس سے بہت پریشان تھے۔

رسوا:۔بھئی واللہ بسم اللہ بھی عجب دل لگی باز رنڈی تھی۔

امراو:۔دل لگی کا کیا ذکر ہے، وہ بے درد چپکی بیٹھی تھی۔تبسم کا اثر بھی چہرے پر نہ تھا۔ میں اور میر صاحب دونوں دم بخود تھے۔ایک عجیب عالم حیرت طاری تھا۔

رہے گا کیوں کوئی طرزِ ستم باقی زمانے میں
مزہ آتا ہے اُس کافر کو الفت آزمانے میں

رسوا:۔یہ جملہ عمر بھر ہنسنے کے لیے کافی ہے، تصور شرط ہے۔تم نے تو بیان کیا اور میری آنکھوں کے سامنے بسم اللہ اور مولوی صاحب اور ان کی مقدس صورت،

میر صاحب، تم، صحن، نیم کا درخت ۔ ان سب کی تصویریں کھنچ گئیں ۔ یہ تو کچھ ایسا واقعہ ہے کہ دفعتاً ہنسی بھی نہیں آتی ۔ اچھا غور کرلوں تو ہنسوں ۔ نا صاحب مجھے ہنسی نہیں آتی ۔ مولوی صاحب کی حماقت پر رونا آتا ہے ۔ بیشک بسم اللہ قیامت کی رنڈی تھی ۔ ستر برس کا بڈھا اس پر یہ حکم ۔ درخت پر چڑھ جاؤ ۔ اور وہ بھی چڑھ گئے ۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا بڑا دقیق مسئلہ ہے ۔

امراو: ۔ واقعی آپ نہیں سمجھ سکتے ۔ اس میں قیامت کی باریکی ہے ۔ آخر بیان ہی کرنا پڑا ۔

رسوا: ۔ للہ بیان کیجیے، کیا ابھی کچھ اور فضیحت باقی ہے؟

امراو: ۔ ابھی بہت سی فضیحتیں باقی ہیں، لے سنیے ۔

مولوی صاحب کے جانے بعد میں نے بسم اللہ جان سے پوچھا تھا ۔

میں: ۔ بسم اللہ یہ تجھ کو ہوا کیا تھا؟

بسم اللہ: ۔ کیا؟

میں: ۔ ستر برس کا بڈھا اور جو درخت پر سے گر پڑتا تو مفت میں خون ہوتا ۔

بسم اللہ: ۔ ہماری بلا سے خون ہوتا ۔ میں تو اس موئے بڈھے سے جلی ہوئی تھی ۔ کل میری دھنوں کو اس زور سے دے پٹخا کہ ہڈی پسلی ٹوٹ گئی ہوتی ۔

بات یہ تھی کہ بسم اللہ جان نے ایک بندریا پالی تھی ۔ اس کا بڑا گہرا سہاگ تھا ۔ ذرا اس کے ٹھاٹھ سن لیجیے ۔ اطلس کے گھنگھریا، کامدانی کُرتی، جالی کی اوڑھنی، چاندی کی چوڑیاں، طوق، گھونگھرو، سونے کی بالیاں، جلیبیاں امرتیاں کھانے کو ۔ جب مول لی تھی تو موئی ذرا سی تھی ۔ دو تین برس میں خوب کھا کھا کے موٹی ہوئی تھی ۔ جو لوگ جانتے تھے وہ تو خیر، اجنبی آدمی پر جا پڑے تو گھگھی بندھ جائے ۔ زور بھی اتنا تھا کہ اچھے مرد کا ہاتھ پکڑے تو چھڑائے نہ چھوٹے ۔

جس دن مولوی صاحب نیم پر چڑھائے گئے ہیں اس سے ایک دن پہلے کا

ذکر ہے کہ آپ تشریف لائے۔ تختوں کے چوکے پر بیٹھے ہوئے کہ بسم اللہ جان کو مسخرہ پن سوجھا۔ دھنوں کو اشارہ کیا۔ وہ پشت سے چپکے سے آئی اور اچک کے مولوی صاحب کے کندھے پر جا بیٹھی۔ مولوی صاحب نے جو مڑ کے دیکھا، بے چارے گھبرا گئے، زور سے جھٹک دیا۔ یہ تخت کے نیچے گر پڑی۔ یا میں تو جانتی ہوں خود چلی گئی ہوگی۔ مولوی صاحب پر کوکھیانے لگی۔ مولوی صاحب نے لاٹھی دکھائی۔ وہ ڈر کے بسم اللہ کی گود میں جا بیٹھی۔ بسم اللہ نے اُسے تو چمکار کر دوپٹے کا آنچل اُڑھا دیا اور مولوی صاحب کو خوب دل کھول کے کوسا، گالیاں دیں۔ اس پر بھی صبر نہ آیا۔ دوسرے دن یہ سزا تجویز کی۔

سروس:۔ سزا مناسب تھی۔

امراو:۔ مناسبت میں تو شک نہیں۔ مولوی صاحب کو لنگور بنا دیا۔

رسوا:۔ واقعی مولوی صاحب لائقِ تعزیر تو تھے۔ قیس نے تو سگِ لیلیٰ کو پیار کر کے گود میں اٹھا لیا تھا اور مولوی صاحب نے بسم اللہ جان کی چہیتی بندریا کو اوّل تو جھٹک دیا پھر یہ بے ادبی کی کہ اسے لاٹھی دکھائی۔ عشق کی شان سے بہت بعید تھا۔

ایک دن رات کے آٹھ بجے بسم اللہ جان کے کمرے میں ہوں۔ بسم اللہ گا رہی ہیں۔ میں تنبورہ چھیڑ رہی ہوں، خلیفہ جی طبلہ بجا رہے ہیں۔ اتنے میں مولوی صاحب قبلہ تشریف لائے۔

بسم اللہ:۔ (دیکھتے ہی) آٹھ دن سے تم کہاں تھے؟

مولوی صاحب:۔ کیا کہوں مجھے تو اب کی ایسی تپ شدید لاحق ہوئی تھی کہ بچنا محال تھا مگر تمہارا دیدار دیکھنا تھا اس لیے جانبر ہو گیا۔

بسم اللہ:۔ تو یہ کہیے کہ وصال ہو گیا ہوتا۔

اس فقرے نے مجھ کو اور خلیفہ کو پھڑکا دیا۔

مولوی صاحب:۔ جی ہاں! آثار تو کچھ ایسے ہی تھے۔

بسم اللہ :۔واللہ اچھا ہوتا۔

مولوی صاحب :۔میرے مرنے سے آپ کو کیا نفع ہوتا ؟

بسم اللہ :۔ جی آپ کے عرس میں ہر سال جایا کرتے ۔گا تے ۔ ناچتے ، لوگوں کو رجھاتے ، آپ کا نام روشن کرتے ۔

اسی طرح کی چند باتوں کے بعد پھر گانا شروع ہوا۔بسم اللہ نے حسب موقع یہ غزل شروع کی۔

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی

اُسی کافر کی ادا یاد آئی

مولوی صاحب پر وجد کی حالت طاری تھی ۔آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ قطرے ریش مقدس سے ٹپک رہے تھے۔اتنے میں سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک صاحب گندمی رنگ، گول چہرہ، سیاہ داڑھی، میانہ قد، کسرتی بدن جامدانی کا انگرکھا، پھنسے پھنسے پائنچوں کا پایجامہ پہنے ہوئے، مخملی جوتا، نہایت عمدہ، جالی پر کی چکن کا رومال اوڑھے ہوئے داخل ہوئے ۔بسم اللہ نے دیکھتے ہی کہا۔واہ صاحب اس دن کے گئے آج آپ آئے ۔ لے بس اب ٹھلیے میں ایسی آشنائی نہیں رکھتی اور وہ لال طاقی گرنٹ[1] کے طاقتے کہاں ہیں ۔اسی سے تو آپ نے منہ چھپایا۔

وہ صاحب :۔(لجاجت کے لہجے میں) نہیں سرکار یہ بات نہیں ہے ۔اس دن سے مجھے فرصت نہیں ملی ۔والد کی طبیعت بہت علیل تھی ۔میں ان کی تیمارداری میں تھا۔

بسم اللہ :۔جی ہاں! آپ ایسے ہی سعادت مند ہیں، مجھے یقین ہے ۔یہ نہیں کہتے کہ بتن کی چھوکری پر آپ فریفتہ ہیں اور رات کو وہیں کی دربارداری ہوتی ہے ۔ مجھے سب خبریں ملتی ہیں اور ہم سے فقرے ہوتے ہیں کہ والد کی طبیعت علیل تھی ۔ اِس آواز کو سن کے ایک مرتبہ مولوی صاحب نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔اِن کی اور اُن کی آنکھیں چار ہوئیں ۔مولوی صاحب نے فوراً منہ پھیر لیا۔

دوسرے صاحب کو جو دیکھتی ہوں تو چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں تھر تھر کانپنے لگے۔ جلدی سے دروازہ کھول کے کمرے کے نیچے تھے۔ بسم اللہ پکارتی کی پکارتی رہی۔ انھوں نے جواب تک نہ دیا۔

بسم اللہ بھی کچھ سمجھ کے پہلے تو کچھ چپ سی ہوگئی مگر ایک مرتبہ تیوری چڑھا کے آپ ہی کہنے لگی ''خیر باشد'' اتنا کہہ کہ گانے میں مصروف ہوگئی۔

اس دن کے بعد میں نے ان کو کبھی بسم اللہ کے پاس آتے نہیں دیکھا۔ مولوی صاحب برابر آیا کیے۔

رسوا:۔ جی ہاں! اگلے زمانے میں لوگ ایسے ہی وضعدار ہوتے تھے۔

گانا ہو رہا تھا کہ گوہر مرزا شاید یہ سن کے کہ میں یہاں ہوں یہیں چلے آئے۔ ان سے اور بسم اللہ سے ہنسی ہوتی تھی۔ گالی گلوج سے لے کے کشتم کشتا تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ میرا مزاج ایسا چھچھورا نہ تھا کہ میں برا مانتی۔

گوہر مرزا میرے اور بسم اللہ کے بیچ بیٹھ گیا اور جھپ سے بسم اللہ کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔

گوہر مرزا:۔ آج خوب گا رہی ہو۔ جی چاہتا ہے.......

اب جو دیکھتی ہوں تو مولوی صاحب کے ماتھے کی جھریوں میں حرکت ہونے لگی۔ ایک ہی مرتبہ گوہر مرزا کی نگاہ مولوی صاحب پر جا پڑی۔ پہلے تو بغور صورت دیکھی پھر اپنا کان زور سے پکڑا جھجک کے پیچھے ہٹا یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آپ سے ڈر گئے۔ بسم اللہ اس حرکت پر بے تحاشا ہنس پڑی۔ خلیفہ جی مسکرانے لگے۔ میں نے منھ پر رومال رکھ لیا۔ مگر مولوی صاحب بہت چیں بجبیں ہوئے بلکہ قریب تھا کہ اٹھ جائیں مگر بسم اللہ نے کہا بیٹھو۔ بے چارے پھر بیٹھ گئے۔ بسم اللہ بھی کیا ہی شریر تھی۔ مولوی صاحب پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ گوہر مرزا میرے آشنا ہیں تا کہ مولوی صاحب دیکھ کے جلیں۔

گوہر مرزا سے ہنسنا شروع کیا۔ بڑی دیر تک مولوی صاحب کو اس دھوکا میں رکھا اور ان کا وہ حال جیسے کوئی انگاروں پر لوٹ رہا ہو، بھلسے جاتے ہیں۔ مارے ہنسی کے میرے پیٹ میں بل پڑے جاتے ہیں۔ آخر مولوی صاحب کی بے کسی پر مجھے رحم آیا۔ میں نے بھانڈا پھوڑ دیا اس میں بسم اللہ مجھ سے ناراض ہوگئیں۔ میں گوہر مرزا کی طرف متوجہ ہو کے کہا۔ "لے بس اب منچلا پن کر چکے، چلو۔"

اب مولوی صاحب کو معلوم ہو گیا کہ گوہر مرزا سے مجھ سے رسم ہے۔ بسم اللہ سے کوئی واسطہ نہیں۔ بہت ہی خوش ہوئے باچھیں کھل گئیں۔

رسوا: ۔مولوی صاحب کو تو پاک محبت تھی نہ؟

امراو: ۔پاک محبت تھی۔

رسوا: ۔پھر ان کو جلنا نہ چاہیے تھا؟

امراو: ۔واہ! کیا پاک محبت میں رشک نہیں ہوتا ہے؟ ہوتا ہے۔

رسوا: ۔تو پاک محبت نہ ہوگی۔

امراو: ۔اب یہ ان کا ایمان جانے۔ میں تو یہی سمجھتی تھی۔

خانم کی نوچیوں میں یوں تو میرے سوا ہر ایک اچھی تھی مگر خورشید کا جواب نہ تھا۔ پری کی صورت تھی، رنگ میدا شہاب، ناک نقشہ گویا صانعِ قدرت نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا، آنکھوں میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ موتی کوٹ کوٹ کر بھر دیے ہیں، ہاتھ پاوں سڈول، نور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، بھرے بھرے بازو، گول کلائیاں، جامہ زیبی وہ قیامت کی کہ جو پہنا معلوم ہوا کہ یہ اسی کے لیے مناسب تھا، اداؤں میں وہ دلفریبی، وہ بھولا پن جو ایک نظر دیکھے ہزار جان سے فریفتہ ہو جائے، جس محفل میں جا کے بیٹھ گئی معلوم ہوا کہ ایک شمع روشن ہوگئی، بیسوں رنڈیاں بیٹھی ہوں نگاہ اسی پر پڑتی تھی۔ یہ سب کچھ تھا مگر تقدیر کی اچھی نہ تھی اور تقدیر کو بھی کیو

ں الزام دیں خود اپنے ہاتھوں عمر بھر خراب رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ رنڈی پنے کے لائق نہ تھی۔ بیسواڑے کے ایک زمیندار کی لڑکی تھی۔ صورت سے شرافت ظاہر ہوتی تھی۔ حسن خداداد تھا مگر اس حسن و جمال پر خبط یہ تھا کہ کوئی مجھ پر عاشق ہو۔ یوں تو خود ہی پیار کرنے کے لائق تھی۔ کون ایسا ہوگا جو اس پر فریفتہ نہ ہو جاتا۔ اوّل ہی اوّل پیارے صاحب کو محبت تھی۔ ہزاروں روپیہ کا سلوک کیا۔ واقعی جان دیتے تھے۔ خورشید نے بھی انھیں اچھی طرح کسا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ سچا عاشق ہے، خود جان دینے لگیں۔ دن دن بھر کھانا نہیں کھاتیں۔ اگر ان کو کسی دن اتفاق سے دیر ہو گئی، بیٹھی زارو قطار رو رہی ہے۔ ہم سب نے صلاح دی۔ دیکھو خورشید ایسا نہ کرو۔ مردوے بے مروّت ہوتے ہیں۔ تمہارے ان کے صرف آشنائی ہے۔ آشنائی کی بنیاد کیا؟ نکاح نہیں ہوا، بیاہ نہیں ہوا۔ اگر ایسا چاہو گی تو اپنا برا چاہو گی۔ پچھتاؤ گی۔ آخر ہمارا ہی کہا ہوا۔ پیارے صاحب نے جب دیکھا کہ رنڈی پیار کرتی ہے لگے غمزے کرنے۔ یا تو آٹھوں پہر بیٹھے رہتے تھے یا اب ہیں کہ دو دو دن نہیں آتے۔ خورشید جان دیے دیتی ہیں۔ روتی ہے پیٹتی ہے۔ کھانا نہیں کھاتی۔ عجیب حال ہے۔ خانم کو صورت سے نفرت ہو گئی۔ یہاں تک کہ آنا جانا کھانا پینا آدمیوں کی تنخواہ سب موقوف۔

میں نہیں سمجھ سکتی کہ اس حسن کے ساتھ عشق اُس کے دل میں کس نے بھر دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی مرد آدمی کی جورو ہوتی تو خوب نباہ ہوتا۔ عمر بھر مرد پاؤں دھو دھو کے پیتا بشرطیکہ قدر دان ہوتا۔ بسم اللہ خورشید کے تلووں کی برابری نہیں کر سکتی تھیں۔ اس پر وہ تمکنت، وہ غرور، وہ غمزہ، وہ نکتوڑے کہ خدا کی پناہ۔ مولوی صاحب

کا حال تو آپ سن ہی چکے ہیں اور آشناؤں سے بھی اس کا سلوک کچھ اچھا نہ ہوتا۔ اصل تو یہ ہے کہ اس کو اپنی ماں کی دولت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ واقعی دولت بھی لازوال تھی۔ اپنے آگے کسی کی ہستی ہی نہ سمجھتی تھی۔ خورشید کی ذات سے خانم کو بڑی

امیدیں تھیں۔ واقعی اگر اس میں رنڈی پن ہوتا تو لاکھوں ہی پیدا کرتی۔ اُس حسن و خوبی پر آواز بالکل نہ تھی۔ ناچنے میں بھی بالکل پھوہڑ تھیں۔ صرف صورت ہی صورت تھی۔ اوّل اوّل مجرے بہت آتے تھے۔ آخر جب معلوم ہوا کہ گانے ناچنے میں تمیز نہیں، لوگوں نے بلانا چھوڑ دیا۔ جو تھا وہ صورت کا مشتاق ہو کے آتا تھا۔ اچھے اچھے مرتے تھے۔ مگر جب آ کے دیکھا، منہ تھوتھائے بیٹھی ہیں۔ ان پر عشق سوار تھا۔ ہر ایک سے بے رخی، بے اعتنائی۔ یہ حالت دیکھ کے لوگوں نے بھی آنا چھوڑ دیا۔ اب پیارے صاحب ہی صرف رہ گئے۔ ادھر تماشہ دیکھیے کہ پیارے صاحب کے والد پر عتاب شاہی نازل ہوا۔ گھر کی ضبطی ہوگئی۔ جاگیر چھین لی گئی۔ بے چارے محتاج ہو گئے۔ یہ سب کچھ ہوا مگر خورشید کے عشق میں کمی نہ ہوئی۔ اب یہ ضد ہوئی کہ مجھے گھر میں بٹھا لو۔

پیارے صاحب نے بپاسِ خاندان یا یوں کہو کہ باپ کے ڈر سے منظور نہ کیا۔ خورشید کی آس ٹوٹ گئی۔

خورشید بہت ہی بھگّی لعورت تھی۔ سیکڑوں روپیہ پھسلا پھسلا کے لوگ کھا گئے۔ فقیر فقرا سے آپ کو بڑا اعتقاد تھا۔ ایک دن ایک شاہ صاحب تشریف لاے۔ وہ ایک کے دو کرتے تھے۔ خورشید نے اپنے کڑے اور کنگن کی جوڑیاں اتار دیں۔ شاہ صاحب نے ایک کوری ہانڈی منگوائی۔ اس میں سیاہ تل بھروائے۔ کڑے کنگن ہانڈی میں رکھ کر چپنی ڈھانک دی۔ شالباف کا ایک پارچہ گلے میں باندھ ناڑے سے باندھ دیا۔ شاہ صاحب روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے کہہ گئے کہ آج نہ کھولنا کل صبح کو کھولنا۔ مرشد کے حکم سے ایک کے دو ہو جائیں گے۔ صبح کو ہانڈی کھولی گئی۔ کالے تلوں کے سوا کچھ نہ ملا۔

ایک جوگی نے کالے ناگ کا پھن منہ سے نکال کے دکھایا کہ یہ تجھے پرسوں آ کے ڈس جائیگا۔ بی خورشید نے کانوں سے پتے بالیاں اُتار کے حوالے کیں۔

خورشید کو غصہ کبھی آتا ہی نہ تھا۔ ایسی نیک دل اور نیک مزاج عورتیں بہو بیٹیوں میں کم ہوتی ہیں۔ رنڈیوں کا کیا ذکر۔ مگر ہاں ایک دن غصہ آیا۔ جس دن پیارے صاحب مانجھے کا جوڑا پہن کے آئے۔ اوّل تو چپکی بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد گالوں پر سرخی نمودار ہوئی۔ رفتہ رفتہ سرخ بھبھوکا ہو گئے۔ اس کے بعد اٹھی، مانجھے کے جوڑے کے پرزے پرزے کر ڈالے۔ اب رقت شروع ہو۔ دو دن تک رویا کی۔ تمام دنیا نے سمجھایا، کچھ نہ مانا آخر بخار آنے لگا۔ دو مہینے بیمار رہی، لینے کے دینے پڑ گئے۔ حکیموں نے دق تجویز کی لیکن خدا کے فضل سے دو مہینے کے بعد خود بخود مزاج رو بہ اصلاح ہو گیا۔ اب پیارے صاحب سے بظاہر چھٹم چھٹا ہو گئی۔ اس کے بعد اور لوگوں سے ملاقات ہوئی مگر کسی سے دل نہ لگا اور نہ کسی کا دل ان سے۔ اس لیے کہ بے توجہی اور بے اعتنائی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی بظاہر ملتی تھی مگر دل نہ ملتا تھا۔

ساون کا مہینہ ہے سہ پہر کا وقت ہے، پانی برس کے کھل گیا ہے۔ چوک کے کوٹھوں اور بلند دیواروں پر جا بجا دھوپ ہے، ابر کے ٹکڑے آسمان پر ادھر اُدھر آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ پچھم کی طرف رنگ رنگ کی شفق پھولی ہوئی ہے۔ چوک میں سفید پوشوں کا مجمع زیادہ ہوتا ہے۔ آج زیادہ تر مجمع کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جمعہ کا دن ہے، لوگ عیش باغ کے میلے کو جلد جلد قدم اٹھائے چلے جاتے ہیں۔ خورشید، امیر جان، بسم اللہ، میں میلے جانے کے لیے بن ٹھن رہی ہیں۔ دھانی دوپٹے ابھی رنگریز رنگ کے دے گیا ہے، چنے جاتے ہیں۔ بالوں میں کنگھی ہو رہی ہے۔ چوٹیاں گوندھی جاتی ہیں۔ بھاری زیور نکالے جاتے ہیں۔ خانم صاحب سامنے چوکے پر گاؤ تکیے سے لگی بیٹھی ہیں۔ بوا حسینی ابھی پیچوان لگا کے پیچھے ہٹی ہیں۔ خانم صاحب کے سامنے میر صاحب بیٹھے ہیں۔ میلے جانے پر اصرار کر رہے ہیں۔ وہ کہتی ہیں آج میری طبیعت سست ہے میں نہیں جانے کی۔ ہم لوگ دعائیں مانگ

رہے خدا کرے نہ جائیں تو میلے کی بہار ہے۔

خورشید پر اس دن غضب کا جوبن ہے۔گوری رنگت ململ کے دھانی دوپٹے سے پھوٹی نکلتی ہے۔اودی گرنٹ کا پاجامہ بڑے بڑے پائچوں کا سنبھالے نہیں سنبھلتا۔چھنسی چھنسی کرتی قیامت ڈھارہی ہے۔ہاتھ گلے میں ہلکا ہلکا زیور ہے۔ ناک میں ہیرے کی کیل، کانوں میں سونے کی انتیاں لے، ہاتھ میں کڑے، گلے میں موتیوں کا کنٹھا۔سامنے کمرے میں قدآدم آئینہ لگا ہے، اپنی صورت دیکھ رہی ہیں۔ کیا کہوں کیا صورت تھی! اگر میری صورت ویسی ہوتی تو اپنے عکس کی آپ ہی بلائیں لے لیتی مگر ان کو یہ غم ہے کہ ہائے اِس صورت پر کوئی دیکھنے والا نہیں۔ پیارے صاحب سے بگاڑ ہی ہو چکا ہے۔چہرہ اداس اداس ہے۔ہاے وہ اداسی بھی غضب کر رہی ہے۔اچھی صورت والوں کا سب کچھ اچھا معلوم ہوتا ہے۔اس وقت اس پری پیکر کی صورت دیکھنے سے دل پسا جاتا ہے اور تو کوئی مثال اپنے دل کی حالت کی سمجھ میں نہیں آتی یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی اچھے شاعر کا کوئی شعر دردآمیز سنا ہے اور دل اس کے مزے لے رہا ہے۔

بسم اللہ کی صورت ایسی بری نہ تھی۔کھلتا ہوا سانولا رنگ، کتابی چہرہ، ستواں ناک، بڑی آنکھیں، سیاہ پتلی، چھریرا بدن، بوٹا سا قد، کارچوبی ٹلواں جوڑا، کاہی کریپ کا دوپٹہ بنت ٹکی ہوئی، زرد گرنٹ کا پاجامہ، بیش قیمت زیور، سر سے پاوں تک گہنے میں لدی ہوئی اُس پر طرّہ پھولوں کا گہنا۔این مَین چوتھی کی دلھن معلوم ہوتی تھی پھر اس پر بات بات میں شوخی وشرارت۔میلے میں پہنچ کر کسی کو منھ چڑادیا، کسی سے آنکھ لڑائی۔جب وہ دیکھنے لگا تو منھ پھیر لیا۔ہاں یہ کہنا بھول گئی کہ ہم لوگ بناوسنگار کر کے میانوں میں سوار ہوئے میلے پہنچے۔

میلے میں وہ بھیڑیں تھیں کہ اگر تھالی پھینکو تو سر ہی سر جائے۔جا بجا کھلونے والوں، مٹھائی والوں کی دکانیں، خوانچہ والے، میوہ فروش، ہاروالے تنبولی، ساقنیں

غرض کہ جو کچھ میلوں میں ہوتا ہے سب کچھ تھا۔ مجھے تو اور کسی چیز سے کچھ کام نہیں، لوگوں کے چہرے دیکھنے کا ہمیشہ سے شوق ہے۔ خصوصاً میلے تماشوں میں خوش ناخوش، مفلس، تونگر، بیوقوف، عقلمند، عالم، جاہل، شریف، رذیل، سخی، بخیل۔ یہ سب حال چہرے سے کھل جاتا ہے۔ ایک صاحب ہیں کہ وہ اپنے تنزیب کے انگرکھے اور اودی صدری، نکہ دار ٹوپی، چست گھٹنے اور مخملی چڑھویں جوتے پر اترائے ہوئے

چلے جاتے ہیں۔ کوئی صاحب ہیں صندلی رنگا ہوا دوپٹہ سر سے آڑا باندھے ہوئے رنڈیوں کو گھورتے پھرتے ہیں۔ ایک صاحب آئے تو ہیں میلہ دیکھنے مگر بہت ہی مکدر، چیں بجبیں، کچھ چپکے چپکے بڑبڑاتے بھی جاتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ بیوی سے لڑکے آئے ہیں۔ جن باتوں کے جواب بروقت نہ سوجھے تھے انھیں اب یاد کر رہے ہیں۔ کوئی صاحب اپنے چھوٹے سے لڑکے کی انگلی پکڑے اس سے باتیں کرتے چلے آتے ہیں۔ ہر بات میں اماں کا نام آتا ہے۔ اماں کھانا پکاتی ہوں گی، اماں کا جی ماندہ ہے، اماں سو رہی ہوں گی، اماں جاگتی ہوں گی، بہت شوخی نہ کیا کرو نہیں تو اماں حکیم کے یہاں چلی جاویں گی۔ ایک صاحب سات آٹھ برس کی لڑکی کو سرخ کپڑے پہنا کے لائے ہیں۔ کندھے پر چڑھائے ہوئے ہیں۔ ناک میں ننھی سی نتھنی ہے، اونچی چوٹی گندھی ہوئی، لال شالباف کا موباف پڑا ہے، ہاتھوں میں چاندی کی چوڑیاں ہیں۔ معصوم کی دونوں ہاتھ زور سے پکڑے ہیں۔ کلائیاں دکھی جاتی ہیں۔ کوئی چوڑیاں نہ اُتار لے۔ کہیے پھر پہنا کے لانا ہی کیا ضرور تھا۔

لیجیے دوسرے صاحب ایک اور، اُن کے یار غار بھی ساتھ ہیں۔ فرمائشی گالیاں چل رہی ہیں۔ اماں پان تو کھاؤ۔ کھٹ سے پیسہ تنبولی کی دکان پر پھینکا۔ معلوم ہوا کہ آپ بڑے تونگر ہیں۔ پیسہ دو پیسہ آپ کے آگے کیا اصل ہے۔ فوراً ہی حقہ والے کو بھی آواز دیدی۔ بھئی ساقی ادھر آنا، حقہ سلگا ہوا ہے؟ ایک اور یار اُن کے

آموجود ہوئے۔ معمولی گالی گلوج کے بعد ملاقات سلام بندگی، مزاج پرسی بے تکلف دوستوں میں ہوا کرتی ہے۔ ابے پان تو کھلوا، لطف تو یہ کہ آپ مسلمان یار ہندو جب تنبولی نے پان دیے جھپ سے بڑھ کے لے لیے۔ ابے یار بھول گئے۔ اب یہ کھسیانے ہوئے ٹینٹ[1] سے ایک پیسہ نکالا لو بھئی ہمیں بھی دو پان دینا۔ الا یچی بھی چھوڑ دینا۔ چونا زیادہ نہ ہو۔ (دوست سے) اچھا لو چلم تو پلواو گے۔ چلم حقہ سے اُتارتے ہی تھے کہ ساقی نے گھور کے دیکھا۔ فوراً ہاتھ سے حقہ اور جیب سے پیسہ نکال کے دیدینا پڑا۔

گوہر مرزا نے موتی جھیل کے کنارے فرش بچھوا دیا تھا، وہیں جا کے ٹھہرے۔ اِدھر اُدھر درختوں میں پھرتے رہے، سرِ شام سے دو گھڑی رات گئے تک میلے کی سیر کی پھر گھر چلنے کی ٹھہری۔ اپنے اپنے میانوں میں سوار ہوئے اب جو دیکھتے ہیں تو خورشید جان کا میانہ خالی ہے۔ اِن کا کہیں پتہ نہ ملا۔ میں خود رات بھر رویا کی۔ پیارے صاحب کے مکان پر آدمی گیا۔ وہ بے چارے اسی وقت دوڑے ہوئے آئے۔ ہزاروں قسمیں کھائیں مجھے بالکل نہیں معلوم۔ میں میلے میں بھی نہیں گیا۔ بیگم کی طبیعت علیل ہے، جاتا تو کیوں کر جاتا۔ پیارے صاحب پر یوں بے جا سا گمان تھا۔ ان کے قسمیں کھانے کے بعد کسی کو شبہ بھی نہ رہا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ شادی کے بعد بیوی کے ایسے پابند ہو گئے تھے کہ چوک کا آنا جانا انھوں نے بالکل موقوف کر دیا تھا۔ رات کو گھر سے نکلتے ہی نہ تھے۔ خورشید کے گم ہونے کی خبر سُن کے کچھ تو اگلی محبت کے خیال سے اور کچھ خانم کی مروّت سے نہیں معلوم کس طرح سے چلے آئے تھے۔

خورشید کے گم ہونے کے ڈیڑھ مہینہ کے بعد ایک صاحب جن کی وضع شہر کی بانکوں کی ایسی تھی۔ سانولا رنگ، چھریرا بدن، ایک دوشالہ کمرے سے لپیٹے اور ایک سرے باندھے میرے کمرے میں درانہ چلے آئے اور آتے کے ساتھ ہی سامنے

قالین کے کنارے بیٹھ گئے۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کے طبیعت میں کسی قدر کمینہ پن ہے یا ابھی انیلےلمیں، رنڈیوں کے یہاں کم جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس وقت میں اکیلی بیٹھی تھی۔ میں نے بوا حسینی کو آواز دی۔ وہ کمرے میں آئیں، ان کے آتے ہیں وہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور کسی قدر بے تکلفی کے ساتھ بوا حسینی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ علیحدہ لے جا کر کچھ باتیں کیں جن میں کچھ نہیں سنیں۔ اس کے بعد بوا حسینی خانم صاحب کے پاس گئیں وہاں سے آ کے پھر باتیں ہوئیں۔ آخر کلام یہ تھا کہ آپ کو ایک مہینہ کی تنخواہ پیشگی دینی ہوگی۔ ان صاحب نے کمر سے بینڈ ٹے[2] روپیوں کی نکالی۔

بوا حسینی نے گود پھیلائی۔ انھوں نے روپے پھینک دیے۔

بوا حسینی: ۔ یہ کتنے ہیں؟

وہ صاحب: ۔ نہیں معلوم گن لیجیے۔

بوا حسینی: ۔ اے مجھے تو نگوڑا گننا بھی نہیں آتا۔

وہ صاحب: ۔ میں جانتا ہوں، پچھتر روپے ہوں گے شاید ایک دو کم ہوں یا زیادہ۔

بوا حسینی: ۔ میاں پچھتر کسے کہتے ہیں؟

وہ صاحب: ۔ تین بیسی اور پندرہ، پچیس کم سو۔

بوا حسینی: ۔ پچیس کم سو۔ تو یہ کتنے دن کی تنخواہ ہوئی؟

وہ صاحب: ۔ پندرہ دن کی۔ کل وہ بھی پندرہ دن کی دے دوں گا۔ پورے ڈیڑھ سو نخرچے آپ کو پہنچ جائیں گے۔

یہ نخرچے سن کے مجھے بہت ہی برا معلوم ہوا۔ اب تو بالکل ہی یقین ہو گیا کہ یہ ایسے ہی ویسے ہوں گے۔ مگر مجبور، رنڈی کا پیشہ۔ دوسرے پرائے بس میں، کرتی تو کیا کرتی؟

بوا حسینی روپے لے کر خانم کے پاس گئیں۔ خانم اس وقت نہیں معلوم کس نیکی کے دم میں تھیں کہ فوراً منظور کر لیا۔ بلکہ تعجب ہوا اس لیے کہ بڑے بڑے رئیسوں

IqbalCyberLibrary.net All rights reserved ©2002-2006

سے روپے کے بارے میں ایک دم کے لیے مروت نہیں کرتی تھیں، یا اس وقت ایک دن کا وعدہ مان لیا۔

اس معاملے کے طے ہونے کے بعد وہ صاحب میرے ہی کمرے میں شب باش ہوئے۔ کوئی پہر رات باقی ہوگی، مجھے فوراً ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے کمرے کے نیچے آ کے دستک دی۔ وہ صاحب فوراً اٹھ بیٹھے اور کہا تو اب میں جاتا ہوں۔ کل شب کو پھر آؤں گا۔ چلتے وقت پانچ اشرفیاں اور تین انگوٹھیاں، ایک سونے کی یاقوت کا نگینہ، ایک فیروزے کی، ایک ہیرے کی مجھ کو دیں اور کہا یہ تم اپنے پاس رکھنا خانم کو نہ دینا۔ میں نے خوشی خوشی اپنے ہاتھ میں پہنیں اور اپنی انگلیوں کو دیکھنے لگی۔ مجھے بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتی تھیں۔ پھر صندوقچہ کھولا۔ اشرفیوں کو اور انگوٹھیوں کو چور خانہ میں رکھ دیا۔

دوسرے دن شب کو پھر وہی صاحب آئے۔ اس وقت میں تعلیم لے رہی تھی۔ وہ ایک کنارے آ کر بیٹھ گئے۔ گانا ہوا کیا۔ پانچ روپے سازندوں کو دیے۔ استاد جی اور سارنگیے خوشامد کی باتیں کرنے لگے۔ استاد جی ان کی کمر میں جو دوشالہ بندھا ہوا تھا اس کے اینٹھنے کی فکر میں تھے۔ پھر منہ پھاڑ کے مانگا۔ مگر وار خالی گیا۔ انھوں نے نہ دیا۔

وہ صاحب:۔ استاد جی۔ روپیہ پیسہ اور جس چیز کو کہیے موجود ہے۔ یہ دوشالہ میں نہیں دے سکتا۔ ایک دوست کی نشانی ہے۔

استاد جی اپنا منہ لے کے چپ ہو رہے۔

اس کے بعد تعلیم ختم ہوئی۔ بوا حسینی کو باقی پچھتر گن دیے گئے۔ پانچ روپیہ بوا کو پنی طرف سے دیے، وہ رخصت ہوئیں۔ جب وہ اور میں صرف دو آدمی گئے میں نے پوچھا آپ نے مجھ کو کہاں دیکھا تھا جو یہ عنایت کی؟

وہ:۔ دو مہینے ہوئے جمعہ کو عیش باغ کے میلے ہیں۔

میں :۔اور پھر آئے دو مہینے کے بعد؟

وہ: ۔میں باہر چلا گیا تھا اور اب پھر جانے والا ہوں۔

اب میں نے رنڈی پن کی لگاوٹ شروع کی۔

میں :۔تو ہمیں چھوڑ کے چلے جاؤ گے؟

وہ: ۔نہیں، پھر بہت جلد چلا آؤں گا۔

میں :۔اور تمہارا مکان کہاں ہے؟

وہ: ۔مکان تو فرخ آباد میں ہے مگر یہاں بہت کام رہتا ہے بلکہ رہتا یہیں ہوں۔
کچھ دنوں کے لیے باہر چلا آتا ہوں۔

میں :۔اور یہ دوشالہ کس کی نشانی ہے؟

وہ: ۔کسی کی نہیں۔

میں :۔واہ! میں سمجھ گئی، یہ تمہاری آشنا کی نشانی ہے۔

وہ: ۔نہیں، تمہارے سر کی قسم میری کوئی آشنا نہیں ہے۔بس تمہیں ہو جو کچھ ہو۔

میں :۔تو پھر مجھے دے دو۔

وہ: ۔میں نہیں دے سکتا۔

یہ بات مجھے بہت ناگوار ہوئی۔اتنے میں انھوں نے بڑے بڑے موتیوں کا مالا جس میں زمرد کی ہڑیں لگی ہوئی تھیں اور ایک جوڑی ہیرے کے کڑے کی اور دو انگوٹھیاں سونے کی میرے آگے رکھ دیں۔ یہ سب تو میں نے خوشی خوشی اٹھا لیا۔ صندوقچہ کھول بند کرنے لگی مگر مجھے تعجب ہوا کہ یہ ہزاروں کی رقم تو یوں مجھ کو دیے دیتے ہیں مگر یہ دوشالہ زیادہ سے زیادہ پانچ سو کا ہوگا، اس سے کیوں انکار کیا؟ واقعی مجھ کو یہ دوشالہ پسند نہ تھا جو میں اصرار کرتی۔اپنے کام سے کام تھا۔

ان صاحب کا نام فیض علی تھا۔پہر ڈیڑھ پہر رات گئے آتے تھے اور کبھی آدھی رات کو۔کبھی پچھلے پہر سے اٹھ کے جاتے تھے۔مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں کئی مرتبہ

دستک یا سیٹی کی آواز میں نے سنی اور فوراً فیض علی اٹھ کے روانہ ہو گئے۔ فیض علی سے رسم ہوئے کوئی ڈیڑھ مہینہ گزرا ہو گا کہ میرا صندوقچہ سادے اور جڑاو گہنے سے بھر گیا۔ اشرفیوں اور روپیوں کا شمار نہیں۔ اب میرے پاس خانم اور بوا حسینی سے چھپا ہوا دس بارہ ہزار کا مال ہو گیا تھا۔

فیض علی سے اگر مجھ کو محبت نہ تھی تو نفرت بھی نہ تھی اور نفرت ہونے کی وجہ؟ اول تو وہ کچھ بد صورت بھی نہ تھے دوسرے لینا دینا عجیب چیز ہے۔ میں سچ کہتی ہوں جب تک وہ نہ آتے تھے میری آنکھیں دروازے کی طرف لگی رہتی تھیں، گوہر مرزا کی آمد و رفت ان دنوں صرف دن کی رہ گئی تھی۔ شب کے آنے والوں میں سے اکثر لوگ سمجھ گئے تھے کہ میں کسی کی پابند ہو گئی ہوں۔ اس لیے سویرے سے کھسک جاتے تھے اور جو صاحب جم کے بیٹھتے تھے ان کو میں کسی حیلے سے ٹال دیتی تھی۔

خورشید کی تلاش بہت کم ہوئی مگر کہیں سراغ نہ ملا۔ اس اثنا میں فیض علی کو مجھ سے بہت محبت ہو گئی تھی جس کا اظہار طرح طرح سے ہوتا تھا۔ اگر میرا دل ابتدا سے گوہر مرزا کی طرف مائل نہ ہو گیا ہوتا تو میں ضرور فیض علی سے محبت کرتی اور اسی کو دل دیتی۔ اس پر بھی میں نے ان کی دلجوئی اور ظاہر داری میں کسی طرح کمی کی۔ میں نے فیض علی کو فریب دے رکھا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے اور بے بچارا میرے دام میں پھنسا ہوا تھا۔ جو کچھ خفیہ اُس نے مجھ کو دیا اس کی کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی۔ خانم اور بوا حسینی کے کہنے سے مجھے فرمائشیں بھی کرنا پڑتی تھیں۔ ان کی بجا آوری کو بھی وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کو روپیہ پیسہ کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ ایسا دل چاک آدمی نہ میں نے رئیسوں میں دیکھا نہ شہزادوں میں۔

رسوا:۔ جی ہاں، کیوں نہیں؟ مالِ مفت دلِ بے رحم۔ بھلا اس کے برابر کس کا دل ہو سکتا تھا؟

امراو:۔ مالِ مفت کیوں؟

رسوا: ۔نہیں تو اپنی اماں جان کا زیور آپ کو اتار کر لا دیا کرتا تھا۔

امراو: ۔ہمیں کیا معلوم تھا؟

شب کے آنے والوں میں ایک پنا مل چودھری تھے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کے چلے جاتے تھے۔ ان کو چار آدمیوں میں بیٹھنے کا مزہ تھا۔ اگر ان کی خاطر داری ہوتی رہے تو اور کسی کے آنے جانے سے انھیں کچھ غرض نہ تھی۔ مہینے میں دو سو روپے کا نقد سلوک اور فرمایشوں کا ذکر نہیں۔ فیض علی سے ملاقات کے زمانے میں ان کی آمدروفت بھی کم ہو گئی تھی۔ یا تو ہر روز آیا کرتے تھے یا دوسرے تیسرے دن آنے لگے۔ پھر ایک مرتبہ پندرہ دن کا غوطہ لگایا۔ اب جو آئے تو کچھ اُداس اُداس۔ معمولی باتوں کا جواب دیتے ہیں اور خاموش ہو جاتے ہیں۔

پنا مل: ۔کیا تم نے سنا نہ ہو گا؟

میں: ۔کیا؟

پنا مل: ۔ہم تو تباہ ہو گئے۔ گھر میں چوری ہو گئی۔ پشتینوں کا اثاثہ اٹھ گیا۔

میں: ۔(چونک کر) ہائیں چوری ہو گئی، کتنے کا مال گیا؟

پنا مل: ۔سب اٹھ گیا، رہا کیا، دو لاکھ کا جواہر اٹھ گیا۔

میں: ۔دل میں تو ہنسی اس بات پر کہ ان کے باپ چھنا مل تو کروڑ پتی مشہور تھے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ دو لاکھ بہت بڑی رقم ہے مگر ان کے نزدیک کیا اصل ہے۔ بظاہر منہ بنا کے بہت افسوس کیا۔

پنا مل: ۔جی ہاں۔ آج کل شہر میں چوریاں بہت ہوتی ہیں۔ نواب ملکۂ عالم کے یہاں چوری ہوئی۔ لالہ ہر پرشاد کے ہاں چوری ہوئی۔ اندھیر ہے۔ سنا ہے باہر سے چور آئے ہیں۔ مرزا علی بیگ بے چارے حیران ہیں۔ شہر کے چور سب طلب ہو گئے تھے۔ کسی سے کچھ پتہ نہیں ملا۔ وہ لوگ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں کہ یہ ہمارا کام

نہیں ہے۔

پنا مل کے آنے کے دوسرے دن میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوں کہ چوک میں ایک شور ہوا۔ میں بھی ایک چلمن کے پاس کھڑی ہوئی۔ اب جو دیکھتی ہوں تو خلائق کا انبوہ ہے۔

ایک:۔ آخر گرفتار ہوئے نا۔

دوسرا:۔ واہ مرزا کیا کہنا۔ کوتوال، ہو تو ایسا ہو۔

تیسرا:۔ کیوں بھئی کچھ مال کا بھی پتہ لگا؟

چوتھا:۔ بہت کچھ برآمد ہوا مگر ابھی بہت سا باقی ہے۔

چھٹا:۔ وہ کیا آتے ہیں۔

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ فیضو میاں بندھے چلے آتے ہیں۔ سپاہیوں کا گارڈ ساتھ ہے گرد خلائق کا انبوہ ہے۔ میاں فیضو منہ پر دوپٹہ ڈالے ہوئے ان کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ دوپہر سے پہلے کا واقعہ ہے۔

حسب معمول فیض علی کوئی پہر رات گئے تشریف لائے۔ کمرے میں میں ہوں اور وہ ہیں۔ آتے ہی کہا، آج ہم باہر جاتے ہیں پرسوں آئیں گے۔ دیکھو امراؤ جان! جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس کو کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ بوا حسینی کو دینا نہ خانم کو دکھانا، تمہارے کام آئے گا۔ ہم پرسوں ضرور آئیں گے۔ اچھا یہ کہو تو ہمارے ساتھ تھوڑے دنوں کے لیے باہر چل سکتی ہو؟

میں:۔ تم جانتے ہو کہ میں اپنے بس میں نہیں، خانم صاحب کو اختیار ہے۔ تم ان سے کہو اگر وہ راضی ہوں تو مجھے کیا عذر ہے؟

فیض علی:۔ سچ ہے کہ تم لوگ بڑے بے وفا ہوتے ہو۔ ہم تو تم پر جان دیتے ہیں، اور تم ایسا خشک جواب دیتی ہو۔ اچھا بوا حسینی کو بلواؤ۔

میں نے بوا حسینی کو آواز دی، وہ آئیں۔

فیض علی:۔ (میری طرف اشارہ کرکے) بھلا کچھ دنوں کے لیے باہر بھی جا سکتی ہیں۔

حسینی:۔کہاں؟

فیض علی:۔فرخ آباد۔ میں کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں۔میری وہاں ریاست ہے۔بالفعل میں دو مہینے کہ لیے وہاں جاتا ہوں۔اگر خانم صاحب منظور کریں تو دو مہینے کی تنخواہ پیشگی بلکہ اس کے علاوہ جو کچھ کہیں میں دینے کو تیار ہوں۔

بوا حسینی:۔مجھے تو نہیں یقین کہ خانم منظور کریں گی۔

فیض علی:۔اچھا تو پوچھو تو۔

بوا حسینی خانم صاحب کے پاس گئیں۔

میرے نزدیک بوا حسینی کو خانم کے پاس بھیجنا بے کار تھا اس لیے کہ مجھے یقین تھا کہ وہ ہرگز منظور نہ کریں گی۔

فیض علی نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا تھا اگر میں نے اپنے اختیار میں ہوتی تو مجھے ان کے ساتھ جانے میں کچھ عذر بھی نہ ہوتا۔ میں یہ خیال کرتی تھی کہ جب اس شخص نے گھر بیٹھے اتنا سلوک کیا تو وطن جا کر تو نہال کر دے گا۔ میں اس خیال میں تھی کہ اتنے میں بوا حسینی نے آکر صاف جواب دیا، ان کا باہر جانا کسی طرح نہیں ہوسکتا۔

فیض علی:۔دوگنی تنخواہ پر سہی۔

بوا حسینی:۔چوگنی پر بھی نہیں۔ہم لوگ باہر نہیں جانے دیتے۔

فیض علی:۔خیر جانے دو.........

بوا حسینی چلی گئیں۔ میں نے دیکھا کہ فیض علی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔یہ حال دیکھ کے مجھے بہت ہی ترس معلوم ہوا۔

معشوقوں کے بے وفائیوں کا تذکرہ قصہ کہانیوں میں جب سنتی تھی تو مجھے

افسوس ہوتا تھا، برا کہتی تھی۔ مجھے یہ خیال آیا کہ اس کا ساتھ نہ دیا تو میری بے وفائی اور احسان فراموشی میں کوئی شبہ نہیں۔

میں نے دل میں ٹھان لیا کہ اس شخص کا ضرور ساتھ دوں گی۔

میں:۔اچھا تو چلوں گی۔

فیض علی:۔چلو گی!

میں:۔ہاں! کوئی جانے دے یا نہ جانے دے میں ضرور چلوں گی۔

فیض علی:۔کیوں کر؟

میں:۔چھپ کے۔

فیض علی:۔اچھا تو پرسوں رات کو ہم آئیں گے۔پہر رات ہے تمہیں یہاں سے نکال لے چلیں گے۔دیکھو دغا نہ دینا ورنہ اچھا نہ ہو گا۔

میں:۔میں اپنی خوشی سے چلنے کو کہتی ہوں تم سے وعدہ کر چکی ہوں، میرے وعدے کو بھی دیکھنا۔

فیض علی:۔بہت اچھا دیکھا جائے گا۔

اس رات کو فیض علی کوئی ڈیڑھ پہر رات رہے میرے پاس سے اٹھ کے چلے گئے۔اُن کے جانے کے بعد میں دل میں غور کرنے لگی، وعدہ تو کر لیا مگر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔جاؤں یا نہ جاؤں؟

جب فیض علی کی محبت اور اپنے وعدے کا خیال آتا تھا تو دل کہتا تھا جانا چاہیے مگر جیسے کوئی منع کرتا تھا کہ نہ جاؤ خدا جانے کیا ہو؟

اسی اُدھیر بن میں صبح ہو گئی۔کوئی بات طے نہ ہوئی۔دن بھر یہیں باتیں دل سے رہیں، رات کو اتفاق سے کوئی میرے پاس نہیں آیا۔کمرے میں اکیلی اسی فکر میں رہی آخر نیند آ گئی۔صبح کو ذرا دن چڑھے سویا کی۔گوہر مرزا نے کچی نیند میں آ کر جھنجھوڑ کے اٹھا دیا۔مجھے بہت ہی برا معلوم ہوا۔دن بھر نشے کا سا خمار رہا۔نہیں

معلوم کس بات پر بوا حسینی سے الجھن ہوگئی، ہاں خوب یاد آیا۔ بات یہ تھی کہ کہیں سے باہر سے مجرا آیا تھا بوا حسینی نے مجھ سے دعا کہا جاؤں گی اس وقت میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ بوا حسینی نے کہا واہ جب نہ تب انکار کر دیتی ہو۔ آخر اس پیشہ میں ہو کر کرو گی کیا؟ میں نے کہا میں تو نہ جاؤں گی۔ بوا حسینی نے کہا نہیں، جانا ہوگا، خاص کر تمہاری فرمائش ہے اور خانم صاحب نے وعدہ کر لیا ہے۔ روپیہ بھی لے لیا ہے۔ میں نے کہا۔ بوا میں نہیں جانے کی روپیہ پھیر دو۔

بوا حسینی: ۔بھلا تم جانتی ہو، خانم صاحب روپیہ لے کے کبھی پھیرتی ہیں؟

میں: ۔چاہے کسی کی طبیعت اچھی ہو چاہے نہ اچھی ہو۔ اگر خانم صاحب روپیہ نہ پھیریں گے تو میں اپنے پاس سے پھیر دوں گی۔

بوا حسینی: ۔آہاہ! اب تم بڑی روپیہ والی ہوگئی لاؤ پھیر دو۔

میں: ۔کتنا روپیہ ہے؟

بوا حسینی: ۔سو روپیہ ہے۔

میں: ۔سو روپیہ لو گی یا کسی کی جان؟

بوا حسینی کو بھی اس دن خدا جانے کہاں کی ضد چڑھ گئی تھی۔

بوا حسینی: ۔بڑی کھری ہو تو دے دو۔

میں: ۔شام کو دے دوں گی۔

بوا حسینی: ۔وہاں باہر کے آدمی بیٹھے ہیں وہ شام تک کے لیے کیوں مانیں گے؟

بوا حسینی اپنے دل میں یہ سمجھے تھیں کہ اس کے پاس روپیہ کہاں سے آیا۔ اگر اس وقت اس حیلے سے تنگ کی جائے گی تو خواہ مخواہ مجرے پر راضی ہو جائے گی۔ میرے صندوقچہ میں اس وقت کچھ نہ ہوں گی تو ہزار ڈیڑھ ہزار کی تو اشرفیاں تھیں زیور کا ذکر نہیں۔ مگر اس وقت بوا حسینی کے سامنے صندوقچہ کھولنا مناسب نہ تھا۔

میں: ۔جاؤ گھنٹہ بھر میں لے جانا۔

بوا حسینی: ۔گھنٹہ بھر میں کیا موکل دے جائیں گے؟

میں: ۔ہاں دے جائیں گے۔ جاؤ بھئی مجھے اس وقت دق نہ کرو میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔

بوا حسینی: ۔آخر کچھ کہو تو لڑکی کیا ہوا؟

میں: ۔مجھے بخار کی سی حرارت ہے اور سر میں شدت سے درد ہو رہا ہے۔

بوا حسینی: ۔(ماتھے پر ہاتھ رکھ کے دیکھا) ہاں سچ تو ہے پنڈا پھیکا ہے مگر مجرے کو تو کہیں پرسوں جانا ہوگا؟ جب تب خدا نہ کرے کیا طبیعت کا یہی حال رہے گا؟ روپے کیوں پھیرے جائیں؟

میں اس بات کا کچھ جواب نہ دینے پائی تھی کہ بوا حسینی جلدی سے اٹھ کے چل دیں۔ بوا حسینی کی اس ہماہمی سے مجھے بہت ہی غصہ معلوم ہوا۔ اسی وقت دل میں بدی آ گئی۔ میں نے کہا واہ جی! جب ان لوگوں کو ہماری دکھ بیماری کا خیال نہیں اپنے مطلب سے مطلب ہے تو ان کے ساتھ رہنا بےکار ہے۔

رسوا: ۔کبھی پہلے بھی یہ خیال آپ کے دل میں آیا تھا؟

امراو: ۔کبھی نہیں، مگر آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں؟

رسوا: ۔اس لیے کہ فیض علی نے جو وہ سہارا دیا تھا اسی سے آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔

امراو: ۔یہ تو کھلی ہوئی بات ہے۔

رسوا: ۔کھلی ہوئی بات تو ہے مگر اس میں ایک باریکی بھی ہے۔

امراو: ۔وہ باریکی کیا ہے؟ خدا کے لیے جلدی کہیے۔

رسوا: ۔فیض علی کے ساتھ نکل جانا، وعدہ کرنے سے پہلے آپ کے دل میں ٹھن گیا تھا، اب دل بہانے ڈھونڈ رہا تھا کیونکر نکل چلوں۔

امراو: ۔نہیں، یہ بات نہ تھی، میں دودلی ہو رہی تھی کہ جاؤں یا نہ جاؤں، گوہر مرزا کے

بے وقت چھیڑنے اور بوا حسینی کی زبردستی سے میں نے جانے کا قصد کرلیا تھا بلکہ اس وقت تک کچھ یوں ہی سا ارادہ تھا، جب تک رات کو فیض علی آئے تھے ان کی صورت اور مستعدی دیکھ کے پکا ارادہ ہوگیا تھا۔

رسوا: ۔ جی نہیں! پہلے ہی سے قصد مصمم ہو چکا تھا۔ اسی لیے گوہر مرزا کا چھیڑنا اور بوا حسینی کی ضد آپ کو بُری معلوم ہوئی ورنہ یہ معمولی باتیں تھیں، ایسا تو اکثر ہوا کرتا ہوگا۔

امراو: ۔ میں نے مانا کہ ایسا ہوگا، اچھا پھر وہ منع کرنے والا کون تھا؟ میں سچ کہتی ہوں کہ چلتے چلتے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کان میں کہہ رہا ہے امراو نہ جا، کہا مان۔ جس وقت دو تین زینے اُتر چکی ہوں اس وقت تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی ہاتھ پکڑ کے کھینچتا ہے کہ نہ جا مگر میں نے نہ مانا۔

رسوا: ۔ یہ روکنے والا بڑا زبردست تھا، اِسی کا حکم نہ ماننے کی تو آپ نے سزا بھگتی۔

امراو: ۔ اچھا، میں سمجھی، یہ وہ چیز ہے جو نیک کاموں کی ہدایت کرتی ہے اور بُرے کاموں سے روکتی ہے۔

رسوا: ۔ جی نہیں یہ وہ نہیں تھی، خانم کے مکان پر رہنا کون سا ایسا اچھا کام تھا، مجھے آپ کی باتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ بدکاری کو ہمیشہ برا سمجھتی رہی ہیں، اگرچہ آپ کی حالت نے آپ کو اُس کے کرنے پر مجبور کیا ہے۔ پھر خانم کے مکان پر رہنے سے ایک شخص کا ساتھ دے کے اس کا پابند ہو جانا بدرجہا بہتر تھا۔

بات یہ تھی کہ فیض علی کے حسنِ سلوک نے آپ کو اس کے ساتھ نکل چلنے کی ترغیب دی تھی۔ قیافہ شناسی کے شوق اور اس میں کسی قدر ملکہ ہو جانے سے آپ اچھی خاصی مردم شناس ہوگئی تھیں۔

عیش باغ کے میلے میں لوگوں کے چہرے دیکھنے کا حال میں نے بڑے شوق سے سنا تھا۔ فیض علی کے کرتوت آپ پر ظاہر نہ تھے مگر اس کی شکل وشمائل، رفتار و گفتار

سے آپ کے دل کو آ گاہی ہوگئی تھی کہ اس کے ساتھ جانے میں کچھ نہ کچھ خطرہ ضرور ہے مگر اس کی فریب کی باتوں اور روپیہ کے لالچ نے آپ کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے تھے۔ افسوس اگر آپ علمِ مردم شناسی کے اصول سے واقِف ہوتیں تو کبھی اِس کے دام میں نہ آتیں۔

امراو:۔ میں پڑھوں گی کسی کتاب کا نام لیجیے۔

خانم کا مکان چوک میں بہت ہی محفوظ جگہ ہے پچھّم کی طرف بازار ہے، اُتر دکن اونچی اونچی رنڈیوں کے کمرے ہیں۔ ایک طرف بیبا جان کا مکان ہے دوسری طرف حسین باندی رہتی تھیں۔ پچھواڑے میں حسین علی صاحب کا دیوان خانہ ہے۔ غرض کہ کسی جانب سے چور کا لگاؤ نہیں ہے۔ اِس پر بھی تین پاسی نوکر تھے جو رات بھر کوٹھوں پر پھرتے تھے۔ جب سے فیض علی کی آمد و رفت شروع ہوئی مکا پاسی خاص میرے کمرے کے دروازے پر رہتا تھے کیوں کہ فیض علی رات گئے آیا کرتے تھے اور پہر رات سے چلے جاتے تھے۔ دروازے بند کرنے اور قفل لگانے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔

شب کو حسب وعدہ فیض علی آئے۔ تھوڑی دیر تک چپکے چپکے چل نکلنے کے مشورے ہوا کیے۔ اتنے میں مکا نے انگڑائی لی۔ معلوم ہوا کہ جاگ رہا ہے۔ فیض علی نے اسے کمرے میں بلایا۔ ''ایک روپیہ انعام لو تم کو ہم نے کچھ نہیں دیا تھا۔ دروازہ بھیڑ دینا ہم جاگ رہے ہیں کوئی ڈر نہیں۔''

مکا سلام کر کے کمرے کے باہر نکل۔ فیض علی نے کہا، لو اب چلو۔ میں اُٹھی۔ دو جوڑے کپڑے دن ہی سے گٹھری میں باندھ رکھے تھے۔ زیور کا صندوقچہ میں نے پہلے ہیں سے کھسکا دیا تھا۔ گٹھری بغل میں دبائی، اکبری دروازہ کی طرف کا راستہ لیا۔

نخاس میں بیل گاڑی پہلے ہی سے کھڑی کی گئی تھی، ہم دونوں سوار ہوئے اور

چل نکلے۔ ہنڈولہ کے ناکے سے تھوڑی دور جا کے فیض علی کا سائیس گھوڑا لیے ہوئے ملا۔ وہ بھی بہلی کے ساتھ ہولیا۔ صبح ہوتے ہوتے موہن لال گنج پہنچے۔ یہاں سرا میں دوپہر تک قیام ہوا۔ بھٹیاری سے کھانا پکوا کے کھایا۔

دال ارہر کی بے نمک پھیکی
مطلقاً جس میں بو نہ تھی گھی کی

تیسرے دن رائے بریلی میں داخل ہوئے۔ یہاں سفر کے مناسب کپڑا خریدا۔ میرے دو جوڑے بنوائے۔ لکھنؤ سے جو کپڑے پہن کر آئی تھی اُتار کے گٹھری میں باندھے۔

رائے بریلی سے بیل گاڑی کو جو لکھنؤ سے آئی تھی رخصت کیا۔ دوسری گاڑی کرایے پر کی۔ لال گنج کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ قصبہ رایے بریلی سے کوئی نو دس کوس کے فاصلے پر ہے شاموں شام پہنچ گئے۔ رات بھر سرائے میں رہے۔ فیض علی ضروری سودے سلف کو بازار گئے۔ جس کوٹھری میں ہم تھے اس کے پاس والی کوٹھری میں ایک دیہاتی رنڈی اُتری ہوئی تھی۔ نصیبن نام تھا۔ گہنے پاتے سے درست تھی۔ کپڑے بھی اچھے تھے۔ تھی تو دیہاتی مگر زبان بہت صاف تھی۔ لب ولہجہ قصباتیوں کا ایسا تھا۔ میری اس کی دیر تک باتیں ہوا کیں۔

نصیبن: ۔آپ کہاں سے آئی ہیں؟

میں: ۔فیض آباد سے۔

نصیبن: ۔فیض آباد تو میری بہن پیارن رہتی ہے آپ ضرور جانتی ہونگی؟

میں: ۔(آخر پہچان گئی نہ کہ میں بھی رنڈی ہوں) میں کیا جانوں۔

نصیبن: ۔فیض آباد میں کون ایسی پتُریا ہے جو ہم کو نہیں جانتی۔

میں: ۔بہت دنوں سے ان کے گھر بیٹھ گئی ہوں۔ یہ لکھنؤ میں رہتے ہیں اسی لیے میں بھی اکثر وہیں رہتی ہوں۔

نصیبن:۔آخر پیدائش تو تمھاری فیض آباد کی ہے؟

میں:۔(یہ تو بالکل سچ کہتی ہے۔اب کیا جواب دوں) ہاں پیدا تو وہاں ہوئی مگر بچپنے سے باہر رہی۔

نصیبن:۔تو فیض آباد میں کسی کو نہیں جانتیں؟

میں:۔کسی کو نہیں۔

نصیبن:۔یہاں کیوں کر آنا ہوا؟

میں:۔ان کے ساتھ ہوں۔

نصیبن:۔اور جاؤ گی کہاں؟

میں:۔اُناؤ

نصیبن:۔لکھنؤ ہوتی ہوئی آئی ہو؟

میں:۔ہاں۔

نصیبن:۔پھر سیدھا راستہ چھوڑ کر اِدھر بیہڑ میں کہاں آئی ہو۔نر پت گنج ہو کے اُناؤ چلی گئی ہوتیں۔

میں:۔رائے بریلی میں اُن کو کچھ کام تھا۔

نصیبن:۔میں نے اس لیے کہا کہ اِدھر کا راستہ بہت خراب ہے۔ڈاکوؤں کے مارے مسافروں کی آمدورفت بند ہے۔ پلیا کی بیہڑ میں سیکڑوں کو لوٹ لیا۔اُناؤ کا رستہ ادھر ہی سے ہو کے ہے۔تم تین آدمی ہو جس میں دو مرد ایک عورت ذات تمھارے ہاتھ گلے میں گہنا بھی ہے۔بھلا تمھاری کیا حقیقت ہے وہاں تو براتیں لٹ جاتی ہیں۔

میں:۔تن بہ تقدیر۔

نصیبن:۔بڑی دل کی کڑی ہو۔

میں:۔پھر کیا کروں؟

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں جن کا دہرانا کوئی ضرور نہیں اور نہ مجھے یاد ہیں۔ہاں میں نے پوچھا۔

تم کہاں جاؤ گی؟

نصیبن:۔ہم تو گدائی کو نکلے ہیں۔

میں:۔نہیں سمجھی۔

نصیبن:۔اے لو گدائی نہیں جانتیں۔کیسی پُتریا ہو؟

میں:۔بہن میں کیا جانوں۔گدائی تو بھیک مانگنے کو کہتے ہیں۔

نصیبن:۔ہمارے دشمن بھیک مانگیں اور سچ پوچھو تو میں کہوں، پُتریا کی ذات تو بھیک منگنی ہے اس میں ڈیرہ ہو یا نہ ہو۔

میں:۔ہاں سچ تو ہے مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ گدائی کس کہتے ہیں۔

نصیبن:۔سال میں ایک مرتبہ ہم لوگ گھر سے نکل کے گاؤں گاؤں پھرتے ہیں۔ امیر رئیسوں کے مکان پر جاکے اترتے ہیں جو کچھ جس کے مقدور میں ہوتا ہے ہمیں دیتا ہے۔کہیں مجرا ہوتا ہے کہیں نہیں ہوتا۔

میں:۔اچھا اس کو گدائی کہتے ہیں۔

نصیبن:۔ہاں اب سمجھیں۔

میں:۔یہاں کس رئیس کے پاس آئی ہو؟

نصیبن:۔یہاں سے تھوڑی دور پر ایک شمبھو دھیان سنگھ راجہ کی گڑھی ہے انھیں کے پاس گئی تھی۔راجا صاحب کو بادشاہی حکم پہنچا ہے۔ڈاکوؤں کے بندوبست کو گئے ہوئے ہیں۔کئی دن ٹھہری رہی آخر دم گھبرایا یہاں چلی آئی۔یہاں سے دو کوس پر ایک گاؤں ہے سمریھا۔وہ گاؤں بالکل پُتریوں کا ہے وہاں میری خالہ رہتی ہیں۔کل ان کے پاس جاؤں گی۔

میں:۔پھر کہاں جاؤ گی؟

نصیبن:۔میں ٹھہری رہوں گی جب راجہ صاحب آجائیں گے تو پھر گڑھی کو جاؤں گی اور بہت سے ڈیرے بھی ان کے انتظار میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

میں:۔کیا راجا صاحب کو ناچ مجرے کا بھی شوق ہے؟

نصیبن:۔بہت شوق تھا۔

میں:۔کیوں اب کیا ہوا؟

نصیبن:۔جب سے ایک پُتریا لکھنؤ سے لائے ہیں ہم لوگوں کی کوئی قدر نہیں رہی۔

میں:۔اس پُتریا کا کیا نام ہے؟

نصیبن:۔نام تو مجھے یاد نہیں۔صورت دیکھی ہے، گوری گوری سی ہے ذرا چہرے مہرے کی اچھی ہے۔

میں:۔گاتی خوب ہوگی؟

نصیبن:۔خاک۔گانا وانا نہیں آتا ہاں ناچتی ذرا اچھا ہے۔راجہ صاحب اس پہ لٹو ہیں۔

میں:۔کتنے دنوں سے وہ پُتریا آئی ہے؟

نصیبن:۔کوئی چھے مہینے ہوئے ہوں گے۔

رات کو میں نے فیض علی سے راستہ کی خرابی کا حال بیان کیا۔انھوں نے کہا، خاطر جمع رکھو ہم نے بندوبست کرلیا ہے۔

دوسرے دن منہ اندھیرے موہن لال گنج کی سرا سے روانہ ہوئے۔نصیبن کی گاڑی ہمارے پیچھے پیچھے تھی۔فیض علی گھوڑے پر سوار تھے۔ہم اور نصیبن باتیں کرتے جاتے تھے۔تھوڑی دور چل کے سمر یہا ملا۔نصیبن نے دور سے ہم کو گاؤں دکھایا۔سڑک کے کنارے کھیت تھے ان میں کچھ گنواریاں پانی دے رہی تھیں، کچھ کھیت نرا رہی تھیں۔ایک پُرائی چل رہی تھی اس میں ایک مسٹنڈی عورت دھوتی

باندھے بیل ہنکار رہی تھی۔ ایک پُر لے رہی تھی۔ نصیبن نے کہا، یہ سب پتریا ہیں۔ میں نے دل میں کہا واہ پیشہ بھی کیا پھر اس قدر محنت جو مردوں سے بمشکل ہو۔ آخر ان کو پتریا ہونا کیا ضرور تھا مگر ان کی صورتیں بھی ایسے ہی کاموں کے لائق ہیں۔ لکھنؤ میں جو کنڈے والیاں، دہی والیاں گھوسنیں آتی ہیں ان کی شکل بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ نصیبن یہاں سے رخصت ہوئی۔

کوئی دو کوس جا کے ایک نشیب ملا۔ جا بجا بیہڑ، بڑے بڑے غار، سامنے ندی کا کنارہ نظر آیا۔ دونوں طرف تک گنجان درختوں کی قطار تھی۔ جب ہم اس موقع پر پہنچے ہیں دھوپ اچھی طرح نکل چکی تھی۔ کوئی پہر بھر دن چڑھا ہوگا۔ اس سڑک پر سوا ہمارے اور کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ ندی کے پاس پہنچ کے فیض علی نے گھوڑا آگے بڑھایا۔ میں روکتی کی روکتی رہ گئی۔ یہ جاوہ جا بہت دور نکل گئے۔ تھوڑی دور تک نظروں سے غائب رہا پھر ندی کے اس پار جا کے معلوم ہوا۔

ہماری گاڑی اسی طرح چلی جاتی تھی۔ گاڑی بان گاڑی ہانک رہا تھا۔ سائیس گھوڑے کے پیچھے دوڑا چلا گیا تھا۔ اب میں ہوں اور گاڑی بان ہے۔ اتنے میں میں نے دور سے دیکھا کہ دس پندرہ گنوار گاڑی کی طرف دوڑے چلے آتے ہیں۔ میں نے دل میں کہا، خدا کرے۔ تھوڑی دیر میں گنواروں نے آ کر گاڑی کو گھیر لیا۔ سب تلواریں باندھے ہوئے تھے۔ بندوقیں کندھے پر تھیں۔ توڑے سلگ رہے تھے۔

گنوار: ۔(گاڑی بان سے) گاڑی روک۔ کون ہے گاڑی میں؟

گاڑی بان: ۔یہ سواری بریلی سے آئی ہے اناؤ کا بھاڑا کیا ہے۔

گنوار: ۔روک گاڑی۔

گاڑی بان: ۔گاڑی کیوں روکیں، خاں صاحب کے یہاں کی زنانی سواری ہے۔

گنوار: ۔کوئی مرد ساتھ نہیں ہے؟

گاڑی بان: ۔مرد آگے بڑھ گئے ہیں آتے ہوں گے۔

گنوار: ۔اترو بی گاڑی سے۔

ایک: ۔پردہ کھول کے کھینچ لو باہر سسری پتریا تو ہے اس کا پردہ کون؟

ایک گنوار آگے بڑھا۔گاڑی کا پردہ الٹ کے مجھے گاڑی سے اتارا۔تین آدمی مجھے گھیر کے کھڑے ہو گئے اتنے میں ندی کی طرف سے گرد اٹھی اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آئی۔جب گھوڑے قریب آئے، میں نے دیکھا آگے فیض علی کا گھوڑا ہے۔پیچھے اور دس پندرہ سوار ہیں۔گنواروں نے دیکھتے ہی بندوقوں کی ایک باڑھ ماری۔اس میں دو سوار اُدھر کے گر پڑے۔پھر تلواریں میان سے نکلیں۔سوار سر ہی پر آ گئے تھے۔ادھر سے بھی تلواریں کھینچ گئیں۔دو ایک ہاتھ چلے ہوں گے، تین گنوار ادھر سے زخمی ہو کے گرے۔ایک سوار اور ادھر گرا۔گنوار بھاگ نکلے۔اچھا کہاں جاؤ گے دیکھو ندی اس پار کیا ہوتا ہے؟

گنواروں کے جانے کے بعد میں پھر گاڑی میں بیٹھی۔جس سوار کے زخم آیا تھا اس کے پٹیاں کسی گئیں۔وہ بھی گاڑی میں میرے ساتھ بٹھایا گیا۔گاڑی روانہ ہوئی۔اب دو سوار ہماری گاڑی کے اِدھر اُدھر ہیں۔کچھ سوار آگے ہیں۔کچھ پیچھے ہیں۔

فیض علی: ۔(اپنے ساتھی سے) بھائی کسی طرح لکھنؤ سے نکلنا ہی نہیں ہوتا تھا۔بڑی مشکل سے جان چھڑا کے آیا ہوں۔

فضل علی: ۔یہ نہیں کہتے عیش میں پڑے تھے۔

فیض علی: ۔ہاں یہ تو کہو گے۔

فضل علی: ۔کہیں گے کیا تحفہ بھی تو ساتھ ساتھ ہے۔ذرا بھابھی صاحب کو ہم بھی تو دیکھیں۔

فیض علی:۔آپ سے کوئی پردہ ہے دیکھیے۔

فضل علی:۔ڈیرے پر چل کے بامراد دیکھیں گے۔

اتنے میں گاڑی ندی کے کنارے پر پہنچ گئی۔ کنارہ بہت اونچا تھا۔ مجھ کو گاڑی سے اُتر کے پیدل چلنا پڑا۔ بڑی مشکل سے گاڑی کنارے تک پہنچی۔ جو زخمی سوار گاڑی میں تھا اس کے زخم گاڑی کے تکان سے کھل گئے تھے۔ تمام گاڑی میں خون ہی خون تھا۔

ندی کے اس پار جا کے زخم پھر سے باندھے گئے تھے۔ گاڑی دھوئی گئی۔ پھر میں گاڑی میں سوار ہوئی۔ اب قریب دوپہر کے دن آچکا، مجھے شدت سے بھوک لگی ہوئی تھی۔ گاڑی اسی طرح چل رہی تھی۔ ان لوگوں کا ڈیرا کہیں نہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ندی سے کوئی چار کوس پر جا کے ایک گاؤں کے پاس باغ تھا۔ اس میں چھولداریاں بڑی پڑی ہوئی تھیں، گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ لوگ اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ کچھ لوگ کھانا پکا رہے تھے۔ یہاں آکر ہماری گاڑی رکی۔ ہمارے ساتھ کے سواروں کو دیکھتے ہی ایک آدمی اس پڑاؤ سے آگے بڑھا۔ اس نے کچھ فضل علی کے کان میں کہا۔ فضل علی کے چہرے سے تشویش کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔ وہ فیض علی کے پاس گھورا دوڑا کے آئے۔ فیض علی سے چپکے چپکے باتیں ہوئیں۔

فیض علی:۔اچھا دیکھا جائے گا کھانا تو کھالو۔

فضل علی:۔کھانا کھانے کی مہلت نہیں ہے، ایسے میں نکل چلو۔

فیض علی:۔اچھا جب تک چھولداریاں اکھاڑی جائیں گھوڑوں پر زین کسے جائیں ہم لوگ کھانا کھالیں۔

میں گاڑی سے اُتری، آم کے درخت کے نیچے دری بچھا دی گئی۔ سالن کی پتیلیاں لا کے رکھی گئیں۔ تھئی کی تھئی روٹیاں موٹی موٹی ٹوکریوں میں آئیں۔ میں، فیض علی اور فضل علی تین آدمیوں نے ساتھ مل کے کھانا کھایا۔ کھانے کھاتے وقت

اگر چہ چہروں پر تشویش کے آثار تھے مگر ہنسی مذاق ہوتا جاتا تھا۔

جتنی دیر میں ہم لوگوں نے کھانا کھایا چھولداریاں اکھاڑ کے ٹٹوؤں پر لادی گئیں زین کسے گئے۔

آخر قافلہ چل نکلا۔

دو ہی تین کوس گئے ہوں گے کہ بہت سے سوار اور پیدلوں نے آکر گھیر لیا۔ اِدھر بھی سب پہلے سے مستعد تھے۔ دونوں طرف گولیاں چلنے لگیں۔ اس لڑائی میں فیض علی میری گاڑی کے آس پاس رہے۔ میں گاڑی کے اندر بیٹھی دعائیں پڑھ رہی ہوں۔ کلیجہ ہاتھوں اچھل رہا ہے، دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی گاڑی کا پردہ کھول کے دیکھ لیتی ہوں۔ یہ گرا وہ مرا۔ آخر دونوں طرف سے بہت سے زخمی ہوئے۔ ہمارے ساتھ پچاس ساٹھ آدمی تھے۔ راجا دھیان سنگھ کے آدمی بہت سے تھے۔ ایک پر دس ٹوٹ پڑے، بہت سے زخمی ہوئے۔ فضل علی موقع پا کر نکل گئے۔ دس بارہ آدمی اور گرفتار ہوئے۔ انھیں گرفتاروں میں بھی تھی۔

ہم لوگوں کی گرفتاری کے بعد گاڑی بان نے منت سماجت کر کے رہائی حاصل کی۔ زخمی سوار کو میدان میں ڈال دیا جہاں اور لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ تو اپنی جان لے کر بریلی کی طرف راہی ہوا۔ مردوں کی مشکیں کسی گئیں۔ گڑھی کی طرف روانہ ہوئے۔ گڑھی وہاں سے کوئی پانچ کوس تھی۔ تھوڑی دور جا کے راجا صاحب اور ان کے ساتھ کے اور لوگ ملے۔ راجا صاحب خود گھوڑے پر سوار تھے۔ ہم لوگ سامنے گئے۔ میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

راجا:۔ یہی بی صاحبہ لکھنؤ سے آئی ہیں؟

میں:۔ (ہاتھ باندھ کے) حضور! قصوروار تو ہوں لیکن اگر غور کیجیے تو ایسا قصور بھی نہیں۔ عورت ذات، جعل فریب سے آگاہ نہیں، میں کیا جانتی تھی۔

راجا:۔ اب اپنی بے قصوری ثابت کرنے کی کوشش نہ کیجیے۔ قصور آپ کا ثابت ہے۔

جو باتیں آپ سے پوچھی جائیں ان کا جواب دیجیے۔

میں:۔جو حکم حاکم۔

راجا:۔لکھنؤ میں مکان کہاں ہے؟

میں:۔ٹکسال میں۔

راجا:۔(آدمیوں کو اشارہ کر کے) دیکھو تم کھیڑے سے ایک بیل گاڑی لے لو۔لکھنؤ کی رنڈیاں ہیں ہمارے دیس کی پتریاں نہیں ہیں کہ رات بھر محفل میں ناچیں اور بارات کے ساتھ دس دس کوس تک ناچتی چلی جائیں۔

میں:۔حضور کو خدا اسلامت رکھے۔

آدمی گئے۔گڑھی سے گاڑی لے آئے۔مجھے گاڑی پر بٹھایا اور لوگ اسی طرح مشکیں کسے ساتھ ساتھ تھے۔

گڑھی میں پہنچ کر وہ لوگ نہیں معلوم کہاں بھیج دیے گئے۔میں کوٹ میں بلائی گئی۔ستھرا مکان رہنے کو دیا گیا۔دو آدمی خدمت کو مقرر ہوئے۔پکا پکایا کھانا پوریاں کچوریاں، مٹھائیاں، طرح طرح کے اچار،لکھنؤ کے چھوڑنے کے بعد آج رات کو کھانا سیر ہو کے کھایا۔دوسرے دن صبح کو معلوم ہوا کہ اور قیدی لکھنؤ کو روانہ کر دیے گئے۔مجھ کو رہائی کا حکم ہے مگر ابھی راجا صاحب رخصت نہیں کریں گے۔پہر دن چڑھے راجا صاحب نے بلا بھیجا۔

راجا:۔اچھا ہم نے تم کو رہا کیا، فیض علی دونوں بدمعاش نکل گئے اور سب نابکار جو گرفتار ہوئے لکھنؤ میں پہنچ کر اپنی سزا کو پہنچیں گے۔بے شک تمہارا کوئی قصور نہیں ہے مگر آیندہ ایسے لوگوں سے نہ ملنا، اگر تمہارا جی چاہے دو چار دن یہاں رہو۔ہم نے تمہارے گانے کی بہت تعریف سنی ہے۔

میں:۔(نصیبن کی وہ بات یاد آئی کہ راجا صاحب کے پاس لکھنؤ کی کوئی رنڈی ہے۔ ہو نہ ہو اس نے میری تعریف کی ہوگی) حضور نے کس سے سنا؟

راجا:۔اچھا یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد لکھنؤ کی وہ رنڈی طلب ہوئی۔لکھنؤ کی رنڈی کون۔ خورشید جان۔خورشید دوڑ کے مجھ سے لپٹ گئی۔ دونوں مل کے رونے لگیں۔آخر راجا صاحب کے خوف سے فوراً علیحدہ ہو کر سامنے مؤدب بیٹھ گئیں۔ سازندے طلب ہوئے رہائی کی خبر سن کے میں نے حسب حال ایک غزل کہہ لی تھی۔ بہت سے شعر تھے۔ جو شعر یاد آتے ہیں سنائے دیتی ہوں۔ ہر ایک شعر پر راجا صاحب اور حاضرین جلسہ بہت ہی محظوظ تھے۔ بے خودی کا عالم تھا۔غزل یہ ہے۔

قیدیِ الفتِ صیاد رہا ہوتے ہیں
خوشنوا یانِ چمن زاد رہا ہوتے ہیں

تو بھی چھوڑے تو تری زلف نہ چھوڑے ہم کو
کوئی ہم اے ستم ایجاد رہا ہوتے ہیں

حسرت اے ذوقِ اسیری کہ خفا ہے صیاد
آج ہم بادلِ ناشاد رہا ہوتے ہیں

خاطرِ نازکِ صیاد کو برداشت نہیں
باعثِ نالہ وَ فریاد رہا ہوتے ہیں

غمِ دنیا نہ سہی اور ہزاروں غم ہیں
قیدِ ہستی سے کب آزاد رہا ہوتے ہیں

کیوں نہ رشک آئے ہمیں تازہ گرفتاروں پر
ہم تو اے لذتِ بیداد رہا ہوتے ہیں

اے اداؔ قیدِ محبت سے رہائی معلوم
کب اسیرِ غمِ صیاد رہا ہوتے ہیں

مقطع سن کے راجا صاحب نے پوچھا آدا کس کا تخلص ہے؟ خورشید نے کہا خود انھیں کی کہی ہوئی ہے۔ راجا اور بھی خوش ہوئے۔

راجا:۔ اگر ایسا جانتے تو ہم آپ کو ہرگز رہا نہ کرتے۔

میں:۔غزل سے حضور کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ اسی کا تو افسوس ہے مگر اب تو حضور حکم دے چکے اور لونڈی آزاد ہو چکی۔

اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ راجا صاحب اندر رسوئی کھانے چلے گئے۔ خورشید سے مجھ سے خوب باتیں ہوئیں۔

خورشید:۔ دیکھو بہن! میرا کوئی قصور نہیں۔ خانم صاحب سے اور راجا صاحب سے بہت دنوں سے لاگ ڈانٹ تھی۔ راجا صاحب نے کئی مرتبہ مجھ کو بلوایا انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ آخر عیش باغ کے میلے میں ان کے آدمی لگے ہوئے تھے۔ مجھ کو زبردستی اٹھا لائے۔ جب سے یہیں ہوں۔ ہر طرح کی میری خاطر ہوتی ہے، سب طرح کا آرام ہے۔

میں:۔موئے گنواروں میں خوب تمہارا جی لگتا ہے؟

خورشید:۔ یہ بات سچ ہے مگر تم میری طبیعت کو جانتی ہو۔ روز ایک نئے شخص کے پاس جانا بالکل خلاف ہے، وہاں یہی کرنا پڑتا تھا۔ خانم کو جانتی ہو، یہاں صرف راجا صاحب سے سابقہ ہے اور سب میرے حکم کے تابع ہیں، دوسرے یہ میرا وطن ہے یہاں کی ہر چیز مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے۔

میں:۔ تو تمہارا ارادہ لکھنؤ جانے کا نہیں؟

خورشید:۔ مجھے تو معاف کرو۔ یہاں اچھی طرح ہوں بلکہ تم بھی یہیں رہو۔

میں:۔ یہاں تو نہ رہوں گی مجبوری کی اور بات ہے۔

خورشید:۔لکھنؤ جاؤ گی؟

میں:۔نہیں۔

خورشید: ۔پھر کہاں؟

میں: ۔جہاں خدا لے جائے۔

خورشید: ۔ابھی کچھ دنوں رہو۔

میں: ۔ہاں ابھی تو ہوں۔

پندرہ بیس دن تک میں گڑھی میں رہی۔ خورشید سے روزانہ ملتی تھی۔ خورشید کا دل وہاں لگا ہوا تھا۔ میرا جی بہت گھبراتا تھا۔ آخر راجا صاحب سے میں نے عرض کیا۔

میں: ۔حضور نے مجھے حکم رہائی دیا ہے۔

راجا: ۔ہاں تو پھر کیا جانا چاہتی ہو؟

میں: ۔جی ہاں! پھر لونڈی کو رخصت کیجیے۔ پھر حاضر ہوں گی۔

راجا: ۔یہ لکھنؤ فقرے ہیں۔ اچھا کہاں جاؤں گی؟

میں: ۔کانپور۔

راجا: ۔لکھنؤ نہ جاؤ گی۔

میں: ۔حضور لکھنؤ کیا منہ لے کے جاؤں گی۔ خانم سے کیسی شرمندگی ہو گی۔ ساتھ والیاں کیا کیا ہنسیں گی۔

اول تو میرا ارادہ لکھنؤ جانے کا نہ تھا دوسرے یہ بھی خیال تھا کہ لکھنؤ جانے کو اگر راجا صاحب سے کہوں گی تو شاید رہائی نہ ہو گی کیوں کہ وہاں جانے سے خورشید کا حال کھل جاتا۔ شاید خانم کوئی آفت برپا کرتیں۔

راجا صاحب میرے اس ارادے سے بہت خوش ہوئے۔

راجا: ۔تو لکھنؤ کبھی نہ جاؤ گی؟

میں: ۔لکھنؤ میں میرا کون بیٹھا ہے۔ گانے بجانے کا پیشہ ہے جہاں رہوں گی کوئی نہ کوئی قدردان نکل ہی آئے گا۔ خانم کی قید میں رہنا اب مجھے منظور نہیں۔ اگر وہاں

رہنا ہوتا تو نکل کیوں آتی؟

میں نے راجا صاحب کو یقین دلا دیا کہ میں لکھنؤ ہر گز نہ جاؤں گی۔

دوسرے دن راجا نے مجھے رخصت کیا۔ دس اشرفیاں انعام دیں۔ ایک دوشالہ دیا، ایک رومال، ایک رتھ مع تین بیل کے۔ غرضکہ مجھے ڈیرہ دار پتریا بنا دیا۔ ایک گاڑی بان اور دو آدمی میرے ساتھ کیے۔ اناؤ کو روانہ ہوئی۔ وہاں پہنچ کر سلارو بھٹیارے کے مکان میں ٹھہری۔ راجا صاحب کے آدمیوں کو رخصت کیا۔ صرف گاڑی بان رہ گیا۔

سر شام میں اپنی کوٹھڑی کے سامنے بیٹھی ہوں۔ مسافر آتے جاتے ہیں۔ بھٹیاریاں چلا رہی ہیں۔ میاں مسافر اِدھر، اُدھر مکان جھاڑا ہوا ہے۔ حقہ پانی کو آرام کھانے پینے کو آرام، گھوڑے ٹٹو کے لیے نیم کا سایہ......

اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ فیض علی کا سائیس چلا آتا ہے۔ سرا کے پھاٹک ہی سے اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ میری اس کی آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ میرے پاس چلا آیا۔ باتیں کرنے لگا۔ میرا حال پوچھا اس کے بعد میں نے فیض علی کا حال پوچھا۔ اس نے کہا، ان کو آپ کے اناؤ آنے کی خبر مل گئی ہے۔ آج رات کو پہر ڈیڑھ پہر رات گئے ضرور آجاویں گے۔

یہ سن کے میرا دل دھڑکنے لگا۔ وجہ یہ تھی کہ مجھے اب فیض علی کا ساتھ منظور نہ تھا۔ تمت کھیڑے کے واقعہ کے بعد میں سمجھی تھی کہ اب گلو خلاصی ہوگئی۔ اناؤ میں فیض علی جان پر نازل ہوگئے۔ معمولی بات چیت کی۔ اناؤ سے روانگی کا مشورہ ہونے لگا۔ بڑی دیر تک باتیں رہیں آخر یہ صلاح ٹھہری کہ گاڑی بان کو رخصت کرو۔ سائیس گاڑی ہنکائے گا، میں خود گھوڑے کو دیکھ لوں گا۔ پھر یہ ٹھہری کہ گاڑی سلارو بھٹیارے کے پاس چھوڑ دو، راتوں رات گنگا اس پار اُتر چلو۔ اب کیا کر سکتی تھی؟ فیض علی کے بس میں تھی جو انھوں نے کہا مجھے چار و نا چار منظور کرنا پڑا۔ فیض علی نے

سلارو کو پکارا۔ کنارے لے جا کر دیر تک باتیں کیں۔ کوئی آدھی رات گئے اپنے ساتھ گھوڑے پر مجھے بٹھایا۔ سرائے سے باہر ہوئے پانچ چھے کوس زمین کا چلنا، رات کا وقت، میرا بند بند ٹوٹ گیا۔ مدتوں درد رہا۔ آخر جوں توں کر کے گنگا کے کنارے پہنچے۔ بڑی مشکل سے ناؤ تلاش کی۔ اس پار اترے۔ فیض علی نے کہا اب کوئی خوف نہیں ہے۔ صبح ہوتے ہوتے کانپور پہنچ گئے۔ فیض علی نے مجھ کو لاٹھی محال میں اُتارا۔ خود مکان کی تلاش میں نکلے۔ تھوڑی دیر کے بعد آ کے کہا ''یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے، مکان ہم نے ٹھہرالیا ہے، وہاں چلی چلو۔ ڈولی کرایہ کی کی۔

تھوڑی دیر میں ڈولی ایک پختہ عالی شان مکان کے دروازے پر ٹھہری۔ فیض علی نے ہم کو یہاں اتارا۔ مکان کے اندر کیا دیکھتی ہوں کہ ایک دالان میں دو کھری چارپائیاں پڑی ہیں۔ ایک چٹائی بچھی ہے اس پر ایک عجیب قطع کا حقہ رکھا ہوا ہے جسے دیکھتے ہی حقہ پینے سے مجھے نفرت ہوگئی۔ مکان کا قرینہ دیکھ کے دل کو وحشت ہونے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد فیض علی نے کہا، اچھا تو میں بازار سے کچھ کھانے کو لے آؤں۔ میں نے کہا بہتر ہے مگر ذرا جلدی آنا۔ فیض علی بازار کو گئے میں اسی میں اکیلی بیٹھی ہوں۔

اب سنیے، فیض علی بازار کو جو گئے تو وہیں کے ہو رہے۔ نہ آج آتے ہیں نہ کل، ایک گھڑی، دو گھڑی پہر دوپہر کہاں تک کہوں۔ دوپہر گزری شام ہونے کو آئی۔ اُناؤ میں سرِ شام کھانا کھایا تھا۔ رات کو گھوڑے پر چلنے کی تکان، نیند کا خمار، صبح سے منہ پر چلو پانی تک نہیں پڑا ٹکڑا تک نہیں کھایا۔ بھوک کے مارے دم نکلا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں سورج ڈوب گیا، اندھیرا ہونے لگا آخر رات ہوگئی۔ یا خدا! اب کیا کروں منہ کھولدیا۔ اٹھ بیٹھی۔ اتنا بڑا ڈھنڈار مکان بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ ہیہات خدا کی ذات اور میں اکیلی۔ یہ معلوم ہوتا تھا اب اس کوٹھڑی سے کوئی نکلا وہ سامنے والے دالان میں کوئی ٹہل رہا ہے، کوٹھے پر دھم دھم کی آواز آئی۔ زینے سے

کوئی کھٹ کھٹ اُترا چلا آتا ہے۔ دوپہر رات ہوگئی اب تک انگنائی اور دیواروں پر چاندنی تھی۔ اب چاند بھی چھپ گیا، بالکل اندھیرا گھپ ہوگیا۔ آخر میں دوشالے سے منہ لپیٹ کے پڑ رہی۔ پھر کچھ کھٹکا ہوا۔ رات پہاڑ ہوگئی، کاٹے نہیں کٹتی ہے۔ آخر جوں توں کر کے صبح ہوئی۔

دوسرے دن صبح کو تو عجب ہی کا عالم تھا۔ اب لکھنؤ، کی قدر ہوئی۔ دل میں کہتی تھی یا خدا کسی مصیبت میں جان پڑی۔ لکھنؤ کا عیش چین اور اپنا کمرہ یاد آتا تھا۔ اِدھر آواز دی اُدھر آدمی مستعد حقہ، پان، کھانا، پانی جو کچھ ہوا اِدھر منہ کیا اُدھر سامنے موجود۔ خلاصہ یہ ہے کہ آج بھی صبح سے دوپہر ہوگئی اور فیض علی نہ آئے۔ اس حالت میں اگر کوئی نیک بخت بی بی چار دیواری کی بیٹھنے والی ہوتی تو ضرور ہی گھٹ گھٹ کے مرجاتی۔ میرا ہواؤ تو کھلا نہ تھا مگر پھر بھی سیکڑوں مردوں میں بیٹھ چکی تھی۔ کانپور نہ سہی لکھنؤ کے تو اکثر گلی کوچوں سے واقف تھی۔ یہاں کی بھی سرا دیکھی تھی، بازار دیکھا تھا۔ اب میری بلا اس خالی مکان میں بیٹھی رہتی۔ جھپ سے کنڈی کھول گلی میں نکل کھڑی ہوئی۔ دس بیس قدم گھر سے گئی ہوں گی کہ دیکھتی ہوں کیا ہوں کہ ایک شخص سرکاری وردی پہنے گھوڑے پر سوار دس پندرہ برق انداز ساتھ ان کے حلقہ میں میاں فیض علی ٹنڈیاں کسی ہوئیں سامنے سے چلے آتے ہیں۔ یہ ماجرا دیکھتے ہی میں سن سے ہوگئی وہیں ٹھٹک گئی۔ ایک پتلی سے گلی ملی۔ تھوڑی دیر یہیں جا کے ٹھہرنا چاہیے۔ دروازہ کھلا تھا۔ میں دَرانہ اندر چلی گئی۔ یہاں ایک مولوی صاحب سے سامنا ہوا۔ کالے سے تھے سر منڈا ہوا تھا۔ ایک نیلی تہمد باندھے ہوئے دھوپ میں ٹہل رہے تھے۔ پہلے تو شاید سمجھے میں طاق بھرنے آئی ہوں بہت ہی خوش ہوئے۔ جب جا کے چپکے سے صحن کے کنارے پاؤں لٹکا کے بیٹھ گئی تو قریب آکے پوچھنے لگے۔ کیوں بی صاحب آپ کا یہاں کیا کام ہے؟

میں:۔ مسافر ہوں۔ خدا کا گھر سمجھ کے تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ گئی ہوں۔ اگر آپ کو

ناگوار ہوتو ابھی چلی جاؤں۔

مولوی صاحب اگرچہ بہت ہی بے تکے تھے مگر میری لگاوٹ اور دل فریب تقریر نے جادو کا اثر کیا۔ بھلا جواب کیا منہ سے نکلتا، ہکا بکا اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ میں سمجھ گئی کہ دامِ فریب میں آ گئے۔

مولوی:۔(تھوڑی دیر کے بعد سنبھل کے) اچھا تو آپ کا کہاں سے آنا ہوا؟

میں:۔جی کہیں سے آنا ہوا مگر بالفعل یہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔

مولوی:۔(بہت ہی گھبرا کے) مسجد میں؟

میں:۔جی نہیں بلکہ آپ کے حجرے میں۔

مولوی:۔لاحول ولاقوۃ۔

میں:۔اوئی۔مولوی صاحب مجھے تو آپ کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا۔

مولوی:۔جی ہاں۔تو میں اکیلا رہتا ہوں اسی سے تو میں نے کہا مسجد میں آپ کا کیا کام ہے؟

میں:۔یہ کیا.....خاصیت ہے کہ جہاں آپ رہیں وہاں دوسرا نہیں رہ سکتا۔مسجد میں ہمارا کچھ کام نہیں، یہ خوب کہی۔آپ کا کیا کام ہے؟

مولوی:۔میں تو لڑکے پڑھاتا ہوں۔

میں:۔میں آپ کو سبق دوں گی۔

مولوی:۔لاحول ولاقوۃ۔

میں:۔لاحول ولاقوۃ۔یہ آپ ہر دفعہ لاحول کیوں پڑھتے ہیں۔یہ کیا شیطان آپ کے پیچھے پھرتا ہے؟

مولوی:۔شیطان آدمی کا دشمن ہے،اس سے ہر وقت ڈرنا چاہیے۔

میں:۔خدا سے ڈرنا چاہیے موئے شیطان سے کیا ڈرنا اور یہ کیا آپ نے کہا آدمی ہیں؟

مولوی:۔(ذرا بگڑ کے) جی ہاں اور کون ہیں؟

میں:۔مجھے تو آپ جن معلوم ہوتے ہیں۔اکیلے اس مسجد میں رہتے ہیں آپ کا دل بھی نہیں گھبراتا ہے؟

مولوی:۔پھر کیا کریں؟ ہمیں تو اکیلے کی عادت ہے۔

میں:۔اُسی سے تو آپ چہرے پر وحشت برستی ہے۔وہ آپ نے نہیں سنا۔

تنہا منشیں کہ نیم دیوانگی است[1]

مولوی:۔اجی وہ کچھ سہی، جس حال میں ہم ہیں خوش ہیں۔آپ اپنا مطلب کہیے۔

میں:۔مطلب تو کتاب دیکھنے سے حل ہوگا، بالفعل زبانی مباحثہ ہے۔

مولوی:۔چہ خوش۔

میں:۔چرا نہ باشد۔

میں مولوی صاحب کو خوب جھنجھوڑیاں دیتی مگر اس وقت بھوک مارے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔

رسوا:۔یہ مولوی صاحب سے اس قدر مذاق کی کیا ضرورت تھی؟

امراو:۔اَے ہے۔اس کا حال نہ پوچھیے۔بعض آدمیوں کی صورت ہی ایسی ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔

رسوا:۔جی ہاں جیسے کسی کی منڈی ہوئی کھوپڑی دیکھ کر بعض آدمیوں کی ہتھیلی کھجلاتی ہے، چپت لگانے کو جی چاہتا ہے۔

امراو:۔بس یہی سمجھ لیجیے۔

رسوا:۔اچھا تو وہ مولوی صاحب میں ایسی کون سی بات تھی جس سے مذاق کرنے کو جی چاہتا تھا۔

امراو:۔کیا کہوں کچھ بیان نہیں ہوسکتا۔جوان آدمی تھے، صورت بھی کچھ ایسی بری نہ تھی۔سانولی رنگت تھی، چہرے پر ہونق پن سا تھا، سر پر لمبے لمبے بال تھے، منہ پر

داڑھی تھی مگر کچھ بے تکے پن کی حد سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی، مونچھوں کا بالکل صفایا تھا، تہمد بہت اونچی بندھی ہوئی تھی، سر پر چھینٹ کی بڑی سی ٹوپی تھی جو سر کی پوری چوحدی کو ڈھانکنے ہوئے تھی۔ بات کرنے کا عجب انداز تھا، منہ جلدی سے کھلتا تھا پھر بند ہو جاتا تھا، نیچے کا ہونٹ کچھ عجب انداز سے اوپر کو چڑھ جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی نکہ دار داڑھی معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ کھا رہے ہیں اور باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ احتیاطاً منہ جلدی سے بند کر لیتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کچھ نکل پڑے۔

رسواؔ:۔ کیا واقعی کچھ کھا رہے تھے۔

امراو:۔ جی نہیں جگالی کر رہے تھے۔

رسواؔ:۔ اکثر کٹ ملا کچھ ایسی ہی صورت بنا لیتے ہیں جسے دیکھ کے بے وقوفوں کو ڈر لگتا ہے اور عقلمند کو ہنسی آتی ہے۔ مجھے ایسی صورتیں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔

امراو:۔ اور سنیے۔ آپ کی گفتگو میں ایک وصف اور بھی تھا وہ یہ کہ اکثر منہ پھیر لیا کرتے تھے۔

رسواؔ:۔ یہ تو عین تمیز داری ہے اس لیے کہ عندالتقریر[1] آپ کے منہ سے تھوک اڑتا ہوگا۔

امراو:۔ کچھ اور بھی عرض کروں۔

رسواؔ:۔ بس اب معاف کیجیے یہاں تو صبح ہوگئی۔

امراو:۔ القصہ میں نے جیب سے ایک روپیہ نکالا۔

مولوی:۔ (یہ سمجھ کے کہ مجھے نذر دیا جاتا ہے جلدی سے ہاتھ تو بڑھا دیا اور منہ سے) اسکی کیا ضرورت تھی؟

میں:۔ (مسکرا کے) اس کی اشد ضرورت تھی اس لیے کہ مجھے بھوک لگی ہے۔ کسی سے کچھ کھانے کو تو منگا دیجیے۔

مولوی:۔ (اب جھینپے تو یوں بات بنانے لگے) میں سمجھا (میں نے دل میں کہا سمجھے

کیا خاک سمجھتے تو پتھر ہو جاتے)۔اسی سے تو کہتا ہوں اس کی کیا ضرورت تھی۔کیا کھانا یہاں ممکن نہیں؟

میں:۔امکان بالقوۃ یا بالفعل بالذات یا بالغیر؟

مولوی:۔بالفعل تو ممکن نہیں، میرا ایک شاگرد لاتا ہوگا، آپ بھی کھا لیجیے گا۔

میں:۔بالفعل تو ممکن نہیں، بالذات کی آپ کو توفیق نہیں اور یہاں ضرورت نے اکل میتت کو جواز کا حکم دے دیا ہے لہذا بازار سے کچھ لا دیجیے۔

مولوی:۔اک ذرا صبر کیجیے کھانا آتا ہی ہوگا۔

میں:۔اب صبر کرنا تکلیف مالا یطاق[2] ہے اور دوسرے میں نے بالتحقیق سنا ہے کہ رمضان شریف ایک مہینے تمام دنیا میں سیر کرتے ہیں اور گیارہ مہینے اسی مسجد میں معتکف رہتے ہیں۔

مولوی:۔اس وقت تو فی نفس[3] الامر کچھ نہیں ہے مگر میرا ایک شاگرد کھانا لے کے آتا ہوگا۔

میں:۔اور بالفرض والتسلیم لو کان محالا۔اگر کھانا آیا بھی تو وہ آپ کی قوتِ لایموت کے لیے بھی کافی نہ ہوگا۔میری شرکت اس میں یعنی چہ۔اور من وجہ کفالت بھی کرے تو الانتظار[4] اشد من الموت کا مصداق ہے تا تریاق[5] از عراق آوردہ شود۔

مولوی:۔اہا! آپ تو بہت قابل معلوم ہوتی ہیں۔

میں:۔مگر میرے زعم ناقص میں آپ کسی قابل نہیں۔

مولوی:۔واقعی ایسا ہی ہے مگر........

میں:۔(بات کاٹ کر) مگر اس لیے کہ یہاں تو آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں اور آپ لاطائل[6] تقریریں کر رہے ہیں۔

مولوی:۔اچھا تو میں ابھی لایا۔

میں:۔للہ ذرا جلدی جایئے۔

خدا خدا کر کے مولوی صاحب گئے اور کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد چار خمیری روٹیاں اور ایک مٹی کے پیالے میں تھوڑا سا نیلا شوربا لا کے میرے سامنے رکھ دیا۔ دیکھ کے جان جل گئی۔مولوی صاحب کی صورت دیکھنے لگی۔مولوی صاحب اپنے دل میں کچھ اور ہی سمجھے۔

مولوی صاحب:۔(فوراً ساڑھے چودہ گنڈے[1] پیسے اور دھیلے کی کوڑیاں چادرے کے کونے سے کھول کے سامنے رکھ دیے) سنیے صاحب چار پیسہ کی روٹیاں ہیں، پیسہ کا سالن ہے، دھیلا بھانج (روپیہ کا خوردہ) میں گیا، آپ کی جمع آپ کے سامنے موجود ہے، پہلے گن لیجیے تو کھا لیجئے گا۔

میں نے پھر ایک مرتبہ مولوی صاحب کی صورت دیکھی تو مگر بھوک بری بلا ہے۔جلدی جلدی نوالے اٹھانا شروع کیے۔جب دو چار نوالے کھا چکی تو مولوی صاحب کی طرف مخاطب ہوئی۔

میں:۔میں نے کہا مولوی صاحب کیا اس اجڑے شہر میں یہی کھانے کو ملتا ہے؟

مولوی:۔تو کیا یہاں لکھنؤ کی طرح محمود کی دکان ہے جہاں پلاو زردہ آٹھ پہر تیار رہتا ہے۔

میں:۔حلوائی کی دکان تو ہو گی؟

مولوی:۔حلوائی کی دکان تو یہ مسجد کے نیچے ہے۔

میں:۔تو پھر چار کوس جانا کیا ضرور تھا۔دوپہر کے بعد آئے اور لے کے کیا آئے موے کتوں کا راتب۔

مولوی:۔ایسا تو نہ کہیے، آدمی کھاتے ہیں۔

میں:۔آپ ایسے آدمی کھاتے ہوں گی، باسی خمیری روٹیاں اور نیلا شوربا۔

مولوی:۔نیلا تو نہیں ہے۔اچھا تو دہی لا دوں؟

میں :۔ جی نہیں، رہنے دیجیے معاف کیجیے۔

مولوی :۔ پیسہ کا خیال نہ کیجیے میں اپنے پاس سے لائے دیتا ہوں۔

میں کچھ جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ مولوی صاحب کے باہر چلے گئے اور ایک آبخورے میں خدا جانے کب کا سڑا کھٹا دہی اٹھالائے اور اس طرح سامنے لا کے رکھ دیا گویا آپ نے حاتم کی گور پر لات ماردی۔

بہر طور نے وہ چاروں روٹیاں اگل نگل کے کھائیں اور کوئی بدھنی بھر کے پانی پیا۔ وہ شوربا اور وہی چھوڑ کے یوں ہی چھوڑ کے یوں ہی اٹھ کھڑی ہوئی، پیسے کوڑیاں بھی وہیں پڑے رہنے دیے۔

میں ہاتھ دھونے کو اٹھی تھی مولوی صاحب سمجھے کہ مسجد سے دفان ہوتی ہے۔

مولوی :۔ اور یہ پیسے اور کوڑیاں تو اٹھا لیجیے۔

میں :۔ میری طرف سے مسجد میں چراغی چڑھا دیجیے۔

منہ ہاتھ دھو کے اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔ مولوی صاحب سے باتیں کرنے لگی۔

کانپور میں مولوی صاحب کی ذات سے بہت آرام ملا۔ انھیں کی معرفت ایک کمرا کرایہ پر لیا۔ نواڑی، پلنگ، دری، چاندنی، چھت پردے، تانبے کے برتن اور سب ضرورت کا سامان خرید لیا۔ ایک ماما کھانے پکانے اور ایک اوپر کے کام کو۔ دو اور خدمت گار نوکر رکھ لیے۔ ٹھاٹھ سے رہنے لگی۔ اب سازندوں کی تلاش ہوئی۔ یوں تو بہت سے آئے مگر کسی کا باج پسند نہ آیا۔ آخر لکھنؤ کا ایک طبلیہ مل گیا۔ یہ خلیفہ جی کے خاندان کا شاگرد تھا اس سے خوب پر گت لملی۔ اس کی معرفت دو سارنگیے

کانپور کے، ذرا سمجھ دار تھے بلوائے۔ طائفہ درست ہو گیا۔ شب کو پہر ڈیڑھ پہر رات تک کمرے پر گانے بجانے کا چرچا ہونے لگا۔ شہر میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ لکھنؤ سے کوئی رنڈی آئی ہے۔ اکثر مرد آدمی آنے لگے۔ شاعری بھی خوب چمکی۔ کوئی دن ایسا ہی کمبخت ہوگا جو کسی جلسہ میں جانا نہ ہوتا تھا۔ مجرے کثرت سے آتے تھے۔

تھوڑے ہی دنوں میں بہت سارو پیہ کمالیا۔ اگرچہ کانپور کے لوگوں کا راہ رویہ، بول چال پسند نہ تھا۔ بات بات پر لکھنؤ یاد آتا تھا مگر خود مختاری کی زندگی میں کچھ ایسا مزہ ہے کہ واپس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اگر لکھنؤ جاؤں گی تو پھر خانم کی نوچی بن کر رہنا پڑے گا کیونکہ اس پیشہ میں رہ کر خانم سے علیحدہ رہنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ ایک تو اس سبب سے کہ تمام رنڈیاں خانم کا دباو مانتی تھیں، اگر میں الگ ہو کے رہتی تو کوئی مجھ سے نہ ملتی۔ دوسرے عمدہ سازندوں کا بہم پہنچنا دشوار تھا۔ ناچ مجرے کا ڈھچر لے کیونکر چل سکتا تھا۔ جن سرکاروں میں میری رسائی ہوتی تھی وہ بھی خانم کی وجہ سے تھی۔ اگرچہ میرا شمار اچھے گانے والیوں میں تھا مگر اس کام کے کرنے والے لکھنؤ میں بہت سے ہیں۔ اچھے برے کا امتیاز خاص لوگوں کو ہوتا ہے۔ عام لوگوں میں نام بکتا ہے۔ بڑے آدمیوں کی نگاہ اثر اونچے ہی کمروں پر جاتی ہے۔ اس حالت میں مجھے کون پوچھتا۔ کانپور میں میرے حوصلے سے زیادہ میری قدردانی ہوتی تھی۔ کسی امیر رئیس کے یہاں کوئی تقریب شادی بیاہ کی نہ ہوتی تھی جس میں میرا بلانا باعثِ فخر نہ سمجھا جاتا ہو۔ باہر جا کر اس بات کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ لکھنؤ کیا چیز ہے۔ یہاں ایک صاحب حضرت شارق لکھنوی بہت مشہور ہیں، استاد مسلم الثبوت سمجھے جاتے ہیں۔ سیکڑوں آپ کے شاگرد ہیں۔ لکھنؤ میں کوئی ان کا نام بھی نہ جانتا تھا۔ ایک دن کا تذکرہ سنیے، ایک صاحب میرے کمرے پر تشریف لائے۔ اثنائے گفتگو میں شعروشاعری کا کچھ چرچا نکلا۔ چھوٹتے ہیں انھوں نے پوچھا، آپ حضرت شارق لکھنوی کو جانتی ہیں؟ میں نے کہا نہیں۔ کون شارق؟ یہ صاحب ان کے شاگردوں میں تھے فوراً بگڑ گئے۔

وہ صاحب:۔ میں تو سنتا تھا آپ لکھنؤ کی رہنے والی ہیں؟

میں:۔ جی ہاں غریب خانہ تو لکھنؤ ہی میں ہے۔

وہ صاحب:۔ بھلا کہیں ہوسکتا ہے کہ آپ لکھنؤ میں ہوں اور حضرتِ استاد کو نہ

جانیں۔

میں:۔لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں کون ایسا ہے جس کو میں نہ جانتی ہوں۔استادوں کا تو ذکر ہی کیا ہے،ان کے نام بر آوردہ شاگردوں میں سے بھی کوئی کم ایسا ہوگا جس کا کلام میں نے نہ سنا ہو،ان کے نام نامی سے تو مطلع فرمائیے۔یہ تخلص تو میں نے کبھی نہیں سنا۔

وہ صاحب:۔(چین بجبیں ہو کے)نام لینے سے کیا فائدہ تخلص شرق سے غرب تک اور شمال سے جنوب تک زبان زدِ خلائق ہے۔ہاں ہاں آپ نہیں جانتیں نہ جانیں۔

میں:۔حضور معاف کیجیے گا۔میرے نزدیک تو یہ شاعرانہ تعلی ہے مگر آپ کے استاد ہیں،آپ کو ایسا ہی کہنا چاہیے۔اچھا تو نام نامی سے تو مطلع فرمائیے۔ممکن ہے کہ میں نے تخلص نہ سنا ہو،نام سے واقف ہوں۔

وہ صاحب:۔میر ہاشم علی صاحب شارقؔ

میں:۔اس نام سے تو بے شک کان آشنا ہیں (اتنا کہہ کے اب میں فکر کرنے لگی یا الٰہی یہ کون میر ہاشم علی صاحب ہیں آخر ایک صاحب پر اشتباہ ہوا) آپ کے استاد مرثیہ خوانی بھی تو کرتے ہیں؟

وہ صاحب:۔جی ہاں!مرثیہ خوانی میں ان کا مثل و نظیر نہیں۔

میں:۔بجا ارشاد ہوا۔یعنی میر صاحب اور مرزا صاحب سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔

وہ صاحب:۔انھیں صاحبوں کے ہم عصر ہیں۔

میں:۔بھلا کس کا مرثیہ پڑھتے ہیں؟

وہ صاحب:۔کسی کا مرثیہ کیوں پڑھنے لگے خود تصنیف فرماتے ہیں۔ابھی ستائیسویں رجب کو نیا مرثیہ پڑھا تھا۔عام شہرہ تھا۔

میں:۔تو آپ کو یاد ہوگا؟

وہ صاحب:۔مطلع تو نہیں۔تلوار کی تعریف میں ایک بند پڑھا تھا،وہ مجھے کیا تمام شہر

کی زباں زد ہے۔ قلم توڑ دیا ہے۔

ذرا ارشاد کیجیے گا۔ میں بھی مستفید ہوں۔

"نکلی غلافِ نور سے تفسیرِ جوہری"

میں:۔ سبحان اللہ! اس بند کے تو دور دور تک شہرے ہیں۔ پانچ مصرعے مجھ سے سن لیجیے۔ واقعی کیا کلام ہے؟

وہ صاحب:۔ (بہت ہی خوش ہوکے) جی ہاں! آپ نے یہ مرثیہ لکھنؤ میں سنا ہوگا۔ وہی تو میں کہتا تھا کہ لکھنؤ کی رہنے والی اور پھر شعر و سخن کا شوق، حضرت شارقؔ کو نہ جانتی ہوں، تعجب ہے۔ اچھا اب میں سمجھا یہ مذاق تھا۔

میرے جی میں تو آیا کہہ دوں کہ آپ کے استاد مر کے بھی جئیں گے تو ایسا بند نہیں کہہ سکتے۔ مرزا دبیرؔ صاحب (مرحوم) کا کلام ہے۔ مگر پھر کچھ سمجھ کے چپ ہو رہی۔

رسواؔ:۔ واقعی آپ نے بڑی عقلمندی کی ورنہ بے چارے کی روزی میں خلل آتا۔ میر ہاشم علی صاحب شارقؔ پر کیا موقوف ہے، اکثر صاحبان کا یہی شعار ہے، دوسروں کا کلام باہر جا کے اپنے نام سے پڑھتے ہیں۔ چند ہی روز کا ذکر ہے ایک صاحب میرے ایک دوست کی غزلوں کے مسودے چرا لے گئے۔ حیدر آباد دکن میں سناتے پھرے۔ بڑے بڑے لوگوں سے داد لی مگر سمجھنے والے سمجھ ہی گئے۔ لکھنؤ میں خطوط آئے، اصل مصنف سے تذکرہ ہوا، وہ ہنس کر چپ ہو رہے۔ اکثر صاحبوں نے لکھنؤ کو ایسا بدنام کیا ہے کہ اب لفظ لکھنوی اپنے نام یا تخلص کے ساتھ لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ایسے ایسے بزرگ لکھنوی لکھتے ہیں جن کی ہفتاد پشت دیہات میں گزر گئی۔ خود لکھنؤ میں چند روز طالب علمی یا اور کسی سلسلے سے آ کے رہے، چلیے اچھے خاصے لکھنوی بن گئے اگر چہ یہ کچھ ایسی فخر کی بات نہیں مگر جھوٹ سے کیا فائدہ؟

امراؤ:۔ جی ہاں اکثر صاحب اسی طرح لکھنؤ فروشی کر کے اپنا بھلا کرتے ہیں۔ کانپور

میں میرا بھی ٹھیک یہی حال تھا۔

اس زمانے میں ریل تو تھی ہی نہیں اور نہ لکھنؤ سے کوئی باہر جاتا تھا بلکہ ہر شہر کے کاملین تلاش معیشت میں یہیں آتے تھے۔ اپنے کمال کی حسبِ حیثیت داد پاتے تھے۔ دہلی اجڑ کے لکھنؤ آباد ہوا تھا۔

رسواؔ:۔ فی زمانہ یہی حال دکن کا ہے، لکھنؤ اجڑ کے دکن آباد ہوا۔ میں تو گیا نہیں مگر سنا ہے کہ محلے کے محلے لکھنؤ والوں سے آباد ہیں۔

امراو:۔ جو صاحب لکھنوی ہونے کا عویٰ کرتے ہیں ان سے کہیے پہلے اپنی زبان کی لوچ نکالیں۔

رسواؔ:۔ کیا خوب بات کہی ہے واقعی روزمرہ تو کسی قدر آ بھی جاتا ہے مگر لہجہ نہیں آتا۔

اتفاقاتِ زمانہ سے یہ کچھ دور نہیں
یوں بھی ہوتا ہے کہ بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں

بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں اور پھر کون بچھڑے ہوئے، وہ جن کے ملنے کا سان گمان بھی نہ ہو۔ ایک دن کا واقعہ سنیے۔ کانپور میں رہتے ہوئے کوئی چھے مہینے گزر گئے ہیں۔ اب شہرت کی یہ حد پہنچی ہے کہ بازاروں اور گلیوں میں میری گائی ہوئی غزلیں لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ شام کو میرے کمرے میں بہت اچھا مجمع رہتا ہے۔

گرمیوں کا دن ہے کوئی دو بجے کا وقت ہوگا، میں اپنے پلنگ پر اکیلی لیٹی ہوں۔ ماما باورچی خانے میں خراٹے لے رہی ہے۔ ایک خدمت گار کمرے کے باہر بیٹھا پنکھے کی ڈوری کھینچ رہا ہے۔ خس کی ٹٹیاں خشک ہوگئی ہیں۔ میں آدمی کو آواز دیا ہی چاہتی تھی کہ پانی چھڑکے اتنے میں کمرے کے نیچے کسی نے آکر پوچھا۔ لکھنؤ

سے جو رنڈی آئی ہے اس کا یہی کمرہ ہے؟ درگا بنیے (جس کی دکان نیچے تھی) نے جواب دیا۔ ہاں یہی ہے۔ پھر دریافت کیا، دروازہ کہاں ہے؟ اس نے بتا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بڑی بی کوئی ستر برس کا سن گوری سی منہ پر جھریاں پڑی ہوئیں، بال جیسے روئی کا گالا، کمر جھکی ہوئی، سفید ململ کا دوپٹہ، تنزیب کا کرتا، نین سکھ کا پاپجامہ، بڑے بڑے پائنچوں کا پہنے، ہاتھوں میں چاندی کے موٹے موٹے کڑے، انگلیوں میں انگوٹھیاں، جریب ہاتھ میں، ہانپتی ہوئی آئیں اور سامنے فرش پر بیٹھ گئیں۔ ایک کالا لڑکا کوئی دس بارہ برس کا ان کے ساتھ تھا۔ وہ کھڑا رہا۔

بڑی بی: لکھنؤ سے تمھیں آئی ہو؟

میں: جی ہاں۔ اتنا کہہ کے میں پلنگ سے نیچے اتر آئی، پاندان آگے کھسکایا آدمی کو حقہ کے لیے آواز دی۔

بڑی بی: ہماری بیگم نے تمھیں یاد کیا ہے۔ لڑکے کی سالگرہ ہے زنانہ جلسہ ہوگا۔ تمھارا مجرا کیا ہے؟

میں: بیگم صاحب مجھ کو کیا جانیں؟

بڑی بی: اے تمام شہر میں تمھارے گانے کی دھوم ہے دوسرے تمھارے بلانے کا بھی یہ بھی ایک سبب ہے کہ بیگم صاحبہ بھی لکھنؤ کی رہنے والی ہیں۔

میں: اور آپ بھی تو لکھنؤ کی ہیں۔

بڑی بی: تم نے کیونکر جانا؟

میں: کہیں بات چیت کا قرینہ چھپا رہتا ہے۔

بڑی بی: ہاں میں بھی وہیں کی رہنے والی ہوں۔ اچھا تو اپنا مجرا تو بتاؤ۔ ابھی بہت کام پڑا ہے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔

میں: مجرا تو میرا کھلا ہوا ہے۔ سب جانتے ہیں۔ پچاس روپے لیتی ہوں مگر بیگم صاحب لکھنؤ کی رہنے والی ہیں اور انھوں نے قدر کر کے بلایا ہے تو ان سے کچھ نہ

لوں گی۔ جلسہ کب ہے؟

بڑی بی: ۔آج شام کو۔ اچھا تو یہ روپیہ کھچڑی کا تو لو۔ باقی وہاں آ کے سمجھ لینا۔

میں: ۔ (روپیہ لے لیا) اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی مگر اس خیال سے کے بیگم صاحب برا نہ مانیں روپیہ لے لیتی ہوں۔ اچھا اب یہ کہیے کہ مکان کہاں ہے؟

بڑی بی: ۔مکان تو ذرا دور ہے، نواب گنج میں ہے۔ یہ لڑکا شام کو آئے گا، اسی کے ساتھ چلی آنا مگر اتنا خیال ہے کہ کوئی مرد ذات تمہارے ملنے والوں میں سے تمہارے ساتھ نہ ہو۔

میں: ۔اور سازندے؟

بڑی بی: ۔سازندے، خدمت گاران کی مناہی نہیں ہے۔ کوئی اور نہ ہو۔

میں: ۔جی نہیں۔ یہاں میرا کون ایسا ملاقاتی ہے جسے ساتھ لاؤں گی۔ خاطر جمع رکھیے۔

اتنے میں خدمت گار نے حقہ تیار کیا۔ میں نے اشارہ کیا۔ بڑی بی کے سامنے لگا دو۔ بڑی بی مزے لے لے کے حقہ پینے لگیں۔ میں ایک پان پر کتھا چونا لگا کے ڈلیوں کا چورا ڈبیہ میں پڑا ہوا تھا ایک چٹکی اس کی اور الا ئچی کے دانے پاندان کے ڈھکنوں پر کچل کے گلوری بنا کے بڑی بی کو دینے لگی۔

بڑی بی: ۔ہائے بیٹا دانت کہاں سے لاؤں جو پان کھاؤں۔

میں: ۔آپ کھائیے تو میں نے آپ ہی کے لائق پان بنایا ہے۔

بڑی بی بیٹھ گئیں۔ پان لے کے کھایا۔ بہت ہی خوش ہوئیں۔ ہائے ہمارے شہر کی تمیز داری۔ اتنا کہہ کے دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہوئیں۔ چلتے چلتے کہہ گئیں ذرا دن سے آجانا۔ گھڑی بھر دن رہے گرہ لگائی جائے گی۔

میں: ۔اگر چہ مجرے کا دستور نہیں ہے مگر خیر بیگم صاحب نے یاد کیا ہے تو میں سویرے سے حاضر ہو کر مبارک باد گاؤں گی۔

واقعی وطن کی قدر باہر جا کے ہوتی ہے۔ کانپور میں سیکڑوں جگہ مجرے ہوئے مگر کہیں جانے کا ایسا اشتیاق ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ جلدی سے شام ہو جائے اور میں روانہ ہوں۔ گرمیوں کا دن پہاڑ ہوتا ہے۔ خدا خدا کر کے اتنا دن کٹا۔ پانچ بجتے بجتے لڑکا آموجود ہوا۔ میں پہلے ہی سے بنی ٹھنی بیٹھی تھی۔ سازندوں کو بلوا رکھا تھا۔ لڑکے نے ان کے مکان کا پتہ بتا دیا۔ میں سوار ہو کے روانہ ہو گئی۔

بیگم کا مکان شہر سے کوئی گھنٹہ بھر کا راستہ تھا ۶ بجے وہاں پہنچی۔ نہر کے کنارے ایک باغ تھا جس کے چاروں طرف مینڈ پر ناگ پھنی اور دوسرے خار دار درخت اسی طرح برابر بٹھائے گئے تھے جس سے دیوار سی بن گئی تھی۔ باغ کی قطع بالکل انگریزی تھی۔ تاڑ، کھجور، اور طرح طرح کے خوبصورت درخت قرینے سے لگائے گئے تھے، روشوں پر سرخی کُٹی ہوئی تھی، چاروں طرف سبزہ تھا، جا بجا کنکروں کی پہاڑیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ ان پر انواع اقسام کے پہاڑی درخت پتھروں کے اندر سے اگے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ پہاڑوں کے گردا گرد دوب جمائی گئی تھی۔ باغ میں ہر چہار طرف پکے برہے بنے ہوئے تھے، ان میں صاف موتی سا پانی بہہ رہا تھا۔ مالی نلوں اور فواروں کے ذریعہ سے پانی دے رہے تھے۔ پتیوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ دن بھر کی دھوپ کھائے ہوئے پھولوں میں، جو اب پانی پہنچا تھا، کیسے ترو تازہ اور شاداب تھے۔ سال گرہ کی رسم کوٹھی میں ادا ہوئی تھی۔ عورتوں کے گانے کی آواز آئی۔ باہر میں نے مبارک باد گائی۔ پھر آپ ہی شام کلیان کی ایک چیز شروع کر دی، کوئی سننے والا نہ تھا آپ ہی آپ گایا کی پھر چپ ہو رہی۔ بیگم صاحب نے ایک اشرفی اور پانچ روپے انعام کے بھیجے۔ تھوڑی دیر میں شام ہو گئی۔ چاند نکل آیا، چاندنی پھیل گئی۔ تالاب کے پانی میں ماہتاب کا عکس موجوں سے ہل کر عجب کیفیت دکھا رہا تھا۔

باغ کے کنارے پر ایک بہت عالی شان کوٹھی تھی۔ وسط باغ میں ایک پختہ

تالاب بنا ہوا تھا۔ اس کی گرد ولایتی پھولوں کے نا ندے[2] نہایت خوبصورتی سے سجے ہوئے تھے۔ اسی تالاب سے ملا ہوا ایک اونچا ہوترا تھا۔ اس کے درمیان ایک مختصر سا ہوا دار چوبی بنگلہ تھا۔ اس کے ستونوں پر رنگ آمیزی کی ہوئی تھی۔ اس تالاب میں نہر سے پانی گرتا تھا۔ پانی کے گرنے کی آواز سے دل میں ٹھنڈک پہنچتی تھی۔ واقعی عجیب عالم تھا۔ شام کا سہانا وقت، ستھری ہوا، رنگ رنگ کے پھولوں میں مہک، ایسی فضا میں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ چبوترے پر سفید چاندنی کا فرش تھا، مسند تکیہ لگا ہوا تھا۔ اسی کے سامنے ہم لوگ بٹھائے گئے۔ کوٹھی سے لے کر اس چبوترے تک گلاب کی بیلوں سے ایک چھتا سا بنا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اسی کی راہ سے بیگم صاحبہ تشریف لاتی ہیں۔ سامنے چلمنیں پڑی ہوئی تھیں۔ چبوترے پر سبز مردلے نگیں روشن ہوگئیں۔ مجھے گانے کا حکم ہوا۔ میں نے کدارے[2] کی ایک چیز شروع کردی۔ بڑی دیر تک گایا کی۔ اتنے میں ایک مہری ہاتھوں میں دو سبز کنول[3] لیے ہوئے باہر نکلی۔ مسند کے سامنے رکھ دیے۔ سازندوں سے کہا ”تم لوگ وہ سامنے شاگرد پیشہ میں چلے جاؤ کھانا بھیج دیا جائے گا۔ اب یہاں زنانہ ہوگا۔“ جب وہ لوگ اٹھ گئے، بیگم صاحب بر آمد ہوئیں۔ میں تعظیم کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ انھوں نے مجھ کو قریب بلایا، خود مسند پر بیٹھ گئیں مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں تسلیم کرکے بیٹھ گئی۔ گانے کے لیے حکم کی منتظر تھی اور بیگم کی صورت غور سے دیکھ رہی تھی

حیرانیِ نگاہ تماشا کرے کوئی
صورت وہ روبرو ہے کہ دیکھا کرے کوئی

پہلے تو وہ باغ اور وہاں کی فضا دیکھ کے مجھے پرستان کا شبہ ہوا تھا مگر اب یقین

ہو گیا کہ پری میرے سامنے گاؤ سے لگی بیٹھی ہے، مانگ نکلی ہوئی ہے، چوٹی کمر تک پڑی ہوئی ہے، سرخ و سفید رنگت، اونچا ماتھا، کھنچی ہوئی بھنویں، بڑی بڑی آنکھیں جیسے گلاب کی پتیاں، لچھوئی[1] ناک، چھوٹا سا دہانہ، پتلے پتلے نازک ہونٹ، نقشے بھر میں

کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے بہتر میرے خیال میں کوئی چیز آ سکتی ہو۔ اس پر اعضاء کا تناسب اور ابھراپن کس قدر خوشنما تھا۔ سیکڑوں عورتیں میری نظر سے گذر گئیں مگر کہاں خورشید کہاں وہ خورشید کی صورت میں پھر ڈومنی پنا تھی۔ اُس میں یہ امیرانہ رعب، یہ تمکنت، یہ بھاری بھرکم پن کہاں۔ دوسرے خورشید ان کے سامنے کسی قدر بھدی معلوم ہوتی تھی۔ ان کا نازک سا چھریرا بدن اس نے کہاں پایا۔ دوسرے اس کی صورت پر آٹھ پہر اداسی برستی تھی۔ جب دیکھو بروگن بنی تھی۔ بیگم صاحبہ بہت ہی خوش مزاج معلوم ہوتی ہیں۔ بات کرتی ہیں تو گویا منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ہر بات پر خود بخود ہنسے دیتی ہیں مگر کسی کو مجالِ کلام نہیں۔ واقعی سادگی میں تکلف اور تمکنت کے ساتھ شوخی انھیں میں دیکھی۔ دولت مندوں کی خوشامد سب کرتے ہیں مگر میں عورت ذات ہو کے کہتی ہوں کہ رئیسوں کی خوشامد بھی اگر بے غرض کی جائے تو کوئی عیب نہیں۔ لباس اور زیور بھی اسی صورت کے لائق تھا۔ مہین بسنتی دوپٹہ کندھوں سے ڈھلکا ہوا، کیچلی کا شلوکا پھنسا پھنسا۔ سرخ گرنٹ کا پاجامہ، کانوں میں صرف یاقوت کے آویزے، ناک میں ہیرے کی کیل، گلے میں سونے کا سادہ طوق، ہاتھ میں سونے کے سرنین[1]، بازوؤں پر نورتن،[2] پاؤں میں سونے کی بیڑیاں،

چہرے کی خوبصورتی، لباس کی سادگی اور زیور کی مناسبت یہ سب چیزیں میری آنکھوں کے سامنے تھیں اور میں نقشِ حیرت بنی بیٹھی تھی۔ بغور صورت دیکھ رہی تھی اور میری صورت تو جیسی کچھ ہے وہ اس وقت آپ کے سامنے ہے۔ مگر یقین کیجیے گا ان کی توجہ کسی اور طرف نہ تھی مجھی کو دیکھ رہی تھیں۔ دونوں طرف سے نگاہیں لڑی ہوئی تھیں، میرے دل میں بار بار ایک خیال آتا تھا مگر اس کے اظہار کا موقع نہ تھا۔

کہوں تو کیوں کر کہوں۔ ایک مہری پس پشت کھڑی پنکھا جھل رہی تھی، دو سامنے کھڑی تھیں، ایک کے ہاتھ میں چاندی کی لوٹیا تھی، دوسرے کے پاس خاصدان۔ بڑی دیر تک نہ بیگم صاحبہ نے مجھ سے بات چیت کی اور نہ کچھ بول سکی۔ آخر انھوں نے سلسلۂ کلام اس طرح سے شروع کیا۔

بیگم:۔تمہارا نام کیا ہے؟

میں:۔(ہاتھ باندھ کے) امراو جان۔

بیگم:۔خاص لکھنؤ میں مکان ہے؟

میں:۔(یہ سوال کچھ اس رخ سے کیا گیا تھا کہ مجھے جواب دینا مشکل ہوا۔ خصوصاً اس موقع پر اس لیے کہ اگر کہتی ہوں کہ لکھنؤ میں میرا مکان ہے تو ایک مطلب جو میرے دل میں تھا فوت ہو جاتا ہے۔ فیض آباد بتاتی ہوں تو بے محل افشائے راز کا خیال ہے۔ آخر بہت سوچ سمجھ کے) جی ہاں پرورش تو لکھنؤ میں پائی ہے۔ جواب دینے کو تو دے دیا مگر اس کے ساتھ ہی خیال ہوا کہ اب جو سوال کیا جائے گا تو پھر دقت پیش آئے گی۔ میرا خیال غلط نہ تھا اس لیے کہ فوراً بیگم صاحبہ نے پوچھا۔

بیگم:۔تو کیا پیدائش لکھنؤ کی نہیں ہے؟

میں:۔اب حیران ہوں کہ کیا جواب دوں۔ تھوڑی دیر سکوت کیا جیسے کچھ سنا نہ تھا۔ (آخر اس بات کو ٹال کے) حضور کا دولت خانہ لکھنؤ میں ہے؟

بیگم:۔کبھی لکھنؤ میں تھا۔ اب تو کانپور وطن ہو گیا۔

میں:۔میرا بھی یہی ارادہ ہے۔

بیگم:۔کیوں؟

میں:۔(اس سوال کا جواب دینا دشوار تھا۔ کون بیان کرتا) اب کیا عرض کروں، بے کار سمع خراشی ہوگی۔ حال ناگفتہ بہ ہے۔ کچھ ایسے ہی اتفاقات پیش آئے۔ لکھنؤ جانے کو جی نہیں چاہتا۔

بیگم:۔چلو اچھا ہے تو ہمارے یہاں بھی کبھی کبھی چلی آیا کرو۔

میں:۔آنا کیسا، میرا تو ابھی سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔اول تو آپ کی قدردانی دوسرے یہ باغ یہ فضا۔ممکن ہے کہ کوئی ایک بار دیکھے اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس نہ ہو۔خصوصاً ایسی خفقانی مزاج کی عورت کے لیے تو یہاں کی آب وہوا اکسیر کا خواص رکھتی ہے۔

بیگم:۔اے ہے! تمہیں یہ جنگلہ بہت پسند آیا، نہ آدمی نہ آدم ذات ہیہات خدا کی ذات، شہر سے کوسوں دور، چار پیسے کا سودا منگاؤ تو آدمی صبح کا گیا شام کو آتا ہے چھائیں پوئیں[1] شیطان کے کان بہرے کوئی بیمار پڑے تو جب تک حکیم شہر سے آئیں آئیں یہاں آدمی کا کام تمام ہو جائے۔

میں:۔حضور اپنی اپنی طبیعت۔مجھے تو بہت پسند ہے میں تو جانتی ہوں کہ اگر یہاں رہوں تو مجھے کسی چیز کی ضرورت ہی نہ ہو۔دوسرے ایسے مقام پر بیمار ہونا کیا ضرور ہے۔

بیگم:۔جب میں پہلے پہل آئی تھی تو میرا بھی یہی خیال تھا۔کچھ دنوں یہاں رہ کے معلوم ہوا کہ شہر کے رہنے والے ایسے مقام پر نہیں رہ سکتے۔شہر میں ہزار طرح کا آرام ہے اور سب باتوں کو جانے دو۔جب سے نواب کلکتہ گئے ہیں، راتوں کو ڈر کے مارے نیند نہیں آتی۔یوں تو خدا کے دیے سپاہی، پاسی، خدمتگار۔اس وقت بھی دس بارہ مرد نوکر ہیں عورتوں کی گنتی نہیں مگر پھر بھی ڈر لگتا ہے، میں دو چار دن اور راہ دیکھتی ہوں اگر نواب جمی[1] جم نہ آئے تو میں شہر میں کوئی مکان لے کے جا رہوں گی۔

میں:۔قصور معاف آپ کا مزاج وہمی ہے، ایسے ایسے وسواس دل میں نہ لایا کیجیے۔شہر میں جایئے گا تو قدر عافیت کھلے گی وہ گرمی ہے کہ آدمی پکسے[2] جاتے ہیں۔دوسرے بیماریاں کہ خدا پناہ رکھے۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں کھلائی بچے کو لے کے آئی۔ تین برس کا لڑکا تھا ماشاءاللہ گورا گورا، خوبصورت، ایسی پیاری پیاری باتیں کرتا تھا جیسے مینا، بیگم نے کھلائی سے لے کے گود میں بٹھالیا۔ تھوڑی دیر کھیلا کودا کے پھر کھلائی کو دینے لگیں کہ میں نے ہاتھ بڑھا کے لے لیا۔ بڑی دیر تک لیے رہی اور پیار کیا کہ پھر کھلائی کو دے دیا۔

میں:۔ یوں تو شاید نہ آتی مگر میاں کو دیکھنے تو ضرور ہی آؤں گی۔

بیگم:۔ (مسکرا کے) اچھا کسی طرح ہو آنا ضرور۔

میں:۔ ضرور حاضر ہوں گی۔ یہ آپ کیوں بار بار فرماتی ہیں۔ میں تو اس قدر حاضر ہوں گی کہ حضور کو دوبھر ہو جاؤں گی۔

اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ بیگم نے میرے گانے کی بہت تعریف کی اسی اثناء میں خاصہ والی نے آ کے کہا کہ خاصہ تیار ہے۔ بیگم نے کہا چلو کھانا کھالو۔

میں:۔ بہت خوب۔

بیگم مسند سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں بھی ساتھ ہی اٹھی۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مہریوں کو اشارہ کیا۔ تم ٹھہرو ہم کھانا کھا کے یہیں بیٹھیں گے۔

میں:۔ واقعی اس وقت کا سماں تو ایسا ہے کہ جانے کو جی نہیں چاہتا مگر حکم حاکم۔

بیگم:۔ تو کیا کھانا یہیں منگوالیا جائے؟

میں:۔ جی نہیں۔ اچھا کھانا کھا کے چلے آئیں گے۔

بیگم:۔ (ایک مہری سے) ان کے ساتھ کے آدمیوں کو کھانا دلوا دیا گیا؟

مہری:۔ (ہاتھ باندھ کے) حضور دلوا دیا گیا۔

بیگم:۔ اچھا انھیں رخصت کرو، ہم نے دوسرا مجرا معاف کیا۔ امراؤ جان کھانا کھا کے جاویں گی۔

اس کے بعد بیگم اور ہم دونوں کوٹھی کی طرف چلے۔ایک مہری آگے آگے فانوس لیے جاتی تھی چپکے سے میرے کان میں کہا، مجھ کو تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں مگر آج اس کا موقعہ نہیں۔کل تو مجھے فرصت نہ ہوگی پرسوں تم صبح آنا اور کھانا یہیں کھانا۔

میں:۔مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہے۔

بیگم:۔اچھا تو آج کچھ نہ کہو۔چلو کھانا کھالیں اس کے بعد تمہارا گانا سنیں گے۔

میں:۔پھر سازندوں کو تو حضور نے رخصت کر دیا۔

بیگم:۔ہم کو مردوں کے ساتھ گانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔میری ایک خواص خوب طبلہ بجاتی ہے اس پر گانا۔

میں:۔بہت خوب!

اب ہم کوٹھی کے پاس پہونچ گئے۔بہت وسیع کوٹھی تھی اور اس طریقے سے سجی ہوئی تھی کہ شاہی کوٹھیوں کو دیکھنے کے بعد اگر کوئی کوٹھی دیکھی تو یہی دیکھی پہلے برآمدہ ملا اس کے بعد کئی کمروں سے ہو کے گزرے۔ہر ایک نئے طرز سے سجا ہوا تھا ہر کمرے کا فرش فروش اور شیشہ آلات ایک نئے رنگ اور نئے طرز کا تھا۔آخر ہم اُس کمرے میں پہنچے جہاں دستر خوان چنا ہوا تھا۔دستر خوان پر دو عورتیں اور منتظر ہیں۔ ان میں سے ایک چٹھی نویس تھی، ایک مصاحب۔ان دونوں کا لباس بھی بہت ہی زرق برق تھا۔صورتیں بھی اچھی تھیں۔

دستر خوان پر کئی قسم کے کھانے پلاؤ، بورانی[1] مزعفر، متنجن، سفیدہ، شیر برنج، باقر خانیاں، کئی طرح کے سالن، کباب، اچار، مربے، مٹھائیاں، دہی، بالائی، غرض کے ہر قسم کی نعمت موجود تھی۔لکھنؤ سے نکلنے کے بعد آج کھانے کا مزہ آیا۔بیگم ہر طرح کی چیزیں میرے سامنے رکھتی جاتی تھیں۔میں اگر چہ کسی قدر تکلف سے کھانا کھاتی تھی مگر ان کے اصرار نے ضرورت سے زیادہ کھلا دیا۔

بیسن دانی اور تسلہ آیا۔ ہاتھ منہ دھو کے سب نے پان کھائے پھر اسی چبوترے پر جلسہ جما۔ اس جلسہ میں صرف بیگم صاحبہ نہ تھیں چٹھی نویس، مصاحبین، مغلانیاں، پیش خدمتیں، مہریاں، مامائیں، سب ملا کے کوئی دس بارہ عورتیں تھیں۔

بیگم صاحبہ نے حکم دیا کہ طبلہ کی جوڑی اور ستار اٹھا لاؤ۔ ایک مصاحب جو طبلہ بجانے میں مشاق تھی، طبلہ بجانے لگی۔ خود بیگم صاحبہ ستار چھیڑنے لگیں، مجھے گانے کا حکم دیا۔

کھاتے کھلاتے دس گیارہ بج چکے تھے، جب ہم گانے کو بیٹھے ہیں ٹھیک بارہ بجے کا وقت تھا۔ اس وقت وہ باغ جس میں بہت سا روپیہ صرف کرکے جنگل اور پہاڑ کی گھاٹیوں کے نمونے بنائے گئے تھے عجب وحشت ناک سماں دکھا رہا تھا۔ ایک طرف چاند اس عالیشان کوٹھی کے ایک گوشے سے تھوڑی دور پر گنجان درختوں کی شاخوں سے نظر آتا تھا مگر اب ڈوبنے ہی کو تھا۔ تاریکی روشنی پر چھائی جاتی تھی جس سے ہر چیز بھیانک معلوم ہونے لگی۔ درخت جتنے اونچے تھے اس سے کہیں بڑے نظر آتے تھے ہوا سَن سَن چل رہی تھی، سرو کے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے اور تو ہر طرف خموشی کا عالم تھا مگر تالاب میں پانی گرنے کی آواز بلند ہوگئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی پرندہ اپنے آشیانے میں چونک کر ایک ہانک بول دیتا تھا۔ یا شکاری جانوروں کے ہول سے جو چڑیاں اڑتی تھیں اس سے پتے کھڑک جاتے تھے۔ یا کبھی کوئی مچھلی تالاب میں اچھل پڑتی تھی۔ مینڈک اپنا بے تکا راگ گا رہے تھے۔ جھینگر آس لے دے رہے تھے۔ سوائے اس چبوترہ کے جہاں دس بارہ جوان عورتیں رنگ رنگ کے لباس پہنے اور طرح طرح کے زیور سے آراستہ جلسہ جمائے بیٹھی تھیں اور کوئی آس پاس نہ تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے کنول بجھ گئے تھے۔ صرف دو مردنگوں کی روشنی تھی ان کے بھی شیشے سبز یا تاروں کا عکس جو تالاب کے پانی میں ہلکورے لے رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ طلسمات کا عالم تھا، وقت اور مقام کی

مناسبت سے میں نے سوہنی کی ایک چیز شروع کردی۔اس راگنی کے بھیانک سروں نے دلوں پر اپنا پورا اثر کیا تھا، سب مبہوت بیٹھے تھے۔

مارے خوف کے باغ کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ خصوصاً گنجان درختوں کے نیچے اندھیرا گھپ تھا سب ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔گویا وہ جلسہ امن کی جگہ تھی۔اور جدھر نگاہ اٹھاکے دیکھو ایک ہو کا عالم تھا۔اوروں کا کیا ذکر خود کلیجہ دھڑک رہا تھا۔اس اثنا میں گیدڑ کے بولنے کی آواز آئی۔اس نے اور بھی دلوں کو ہلا دیا۔اس کے بعد کتے بھونکنے لگے۔اب تو مارے دہشت کے یہ حال تھا کہ کسی کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔اتنے میں بیگم نے گاؤتکیہ سے ذرا اونچی ہو کے اپنے سامنے کچھ دیکھا اور زور سے ایک چیخ مار کے مسند پر گر پڑیں اور سب عورتیں بھی اسی طرف دیکھنے لگیں، میں بھی مڑ کے دیکھنے لگی۔

میں بیگم صاحب کو سمجھ چکی تھی کہ وہمی ہیں مگر اب جو دیکھتی ہوں تو ان کے وہم کی حقیقت نظر آنے لگی۔سامنے سے دس پندرہ آدمی منہ پر ڈھانٹے باندھے، ننگی تلواریں ہاتھ میں دوڑتے چلے آتے ہیں۔عورتوں کے چلانے سے بیگم کے نوکر جاکر خدمت گار، پاسی اسی طرف چلے، کوئی نہتا کسی کے ہاتھ میں لاٹھی، مگر ڈاکو زیادہ تھے اور یہاں آدمی کم تھے۔کئی تو راستے سے فرار ہو گئے۔پانچ چار آدمی چبوترے تک پہنچ ہی گئے۔انھوں نے آکر عورتوں کو بیچ میں کرلیا اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو کے کھڑے ہو گئے۔عورتوں سے کسی کو ہوش نہ تھا۔سب غش کی حالت میں بے دم پڑی تھیں۔ایک میں خدا جانے کیا پتھر کا دل تھا کہ بیٹھی رہی۔مارے ہول کے دم نکلا جاتا تھا۔یا اللہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

بیگم کے آدمیوں میں سے جن کے پاس حربے تھے وہ آگے بڑھنے ہی کو تھے کہ سرفراز نامی ایک سپاہی نے روکا۔

سرفراز:۔(اپنے ساتھیوں سے) ٹھہرو بھئی جلدی نہ کرو۔پہلے ہمیں ان لوگوں

کا عندیہ معلوم کر لینے دو (ڈاکوؤں سے) تم لوگ کس ارادے سے آئے ہو؟

ایک ڈاکو:۔جس ارادے سے آئے ہیں تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔

سرفراز:۔وہی میں پوچھتا ہوں۔جان کے خواہاں ہو یا مال کے؟

دوسرا ڈاکو:۔ہمیں جان سے کوئی غرض نہیں، کوئی باپ مارے کا بیر ہے۔ ہاں جس ارادے سے آئے ہیں اُس میں تم مزاحم ہو گے تو دیکھا جائے گا۔

سرفراز:۔(کسی قدر سخت ہو کے) تو کیا بہو بیٹیوں کی آبرو لو گے، اگر یہ مقصد ہو.....

سرفراز پوری بات بھی ختم نہ کرنے پایا تھا کسی نے ڈاکو کی طرف سے کہا۔

کوئی ڈاکو:۔نا صاحب کسی کی بہو بیٹیوں سے کیا واسطہ، کیا ہمارے بہو بیٹیاں نہیں ہیں۔عورتوں کے کوئی ہاتھ لگا سکتا ہے۔اس آواز پر مجھے کچھ شبہہ سا ہوا۔

سرفراز:۔(خوش ہو کے) تو پھر یہی تو پوچھتا ہوں، اچھا تو بھائیو ہم ابھی تمہیں کوٹھی کے کمروں کی کنجیاں منگائے دیتے ہیں اور جو عورتیں وہاں ہیں ان کو یہاں بلوائے لیتے ہیں۔گھر کی مالک بیگم یہیں ہیں۔تم شوق سے کوٹھی میں جاؤ۔ جو جی چاہے اٹھا لے جاؤ۔رہا عورتوں کا زیور وہ بھی اتروائے دیتے ہیں۔ ہمارا مالک کچھ اس سے غریب نہ ہو جائے گا۔خدا کے حکم سے لاکھوں روپیہ بنک گھر میں جمع ہے۔علاقہ سے جو روپیہ آتا ہے اس کا ذکر نہیں۔

ڈاکو:۔اس سے بہتر کیا ہے مگر دیکھو اس میں دغا نہ ہو۔

سرفراز:۔سپاہی کے پوت دغا نہیں دیتے۔خاطر جمع رکھو۔

وہی ڈاکو جس کی آواز میں نے پہچانی تھی آگے بڑھا۔"واہ کیا کہنا مردوں کا قول ہی تو ہے۔اچھا کنجیاں؟"

اتنا کہنا تھا کہ میرے اس کے نگاہیں چار ہوئیں۔میں نے پہچان لیا بولنے کا قصد کیا مگر دل میں ایسی دہشت سمائی ہوئی تھی کہ منہ سے آواز نہ نکلتی تھی کہ اتنے میں خود اس نے آگے بڑھ کے کہا۔

''بھائی تم یہاں یہاں؟''

میں:۔ جب سے تمہارے بھائی قید ہو گئے یہیں ہوں۔

فضل علی:۔ یہاں کس کے پاس؟

میں:۔ رہتی تو شہر میں ہوں مگر یہاں میری ایک بہن بیگم صاحب کے پاس نوکر ہیں۔ان سے ملنے آئی تھی۔

فضل علی:۔ تمہاری بہن کہاں ہیں؟

میں:۔یہیں ہیں۔ جب سے تم لوگوں کے آنے کا ہنگامہ ہوا' بے چاری غش میں پڑی ہیں۔میری طرح تو ہیں نہیں، بے چاری پردہ نشین ہیں۔ جوانی میں رانڈ ہوئیں جب سے امیر رئیسوں کی نوکریاں کرتی پھرتی ہیں۔

فضل علی:۔(اپنے ساتھیوں سے) یہاں سے ایک پیسہ کی چیز لینا تو میرے نزدیک حرام ہے اور نہ اس معاملہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

ایک ڈاکو:۔ یہ کیا۔ پھر آئے کیوں تھے؟

فضل علی:۔جس ارادے سے آئے تھے تمہیں معلوم ہے مگر کسی کا کچھ خیال بھی ہے۔ مجھ سے تو نہیں ہو سکتا کہ فیضو بھائی کی آشنا اور اس کی بہن کا اسباب لوٹوں یا اس سرکار سے ان لوگوں کا توسل ہو وہاں دست درازی کروں۔ اگر وہ قید میں سنے گا تو کیا کہے گا۔

اس بات پر ڈاکوؤں کے آپس میں بہت جھگڑا ہونے لگا مگر سب فضل علی کا دباؤ مانتے تھے۔کوئی دم نہ مار سکتا تھا پھر بھی خالی ہاتھ پھر جانا کچھ ایسی سہل بات نہ تھی۔سب ڈاکو غل مچاتے تھے۔فاقوں مرتے ہیں ایک موقع ملا بھی تو اسے خاں صاحب چھوڑ دیتے ہیں۔آخر پیٹ کہاں پالیں۔

جب فضل علی اپنے گروہ سے نکل کر الگ کھڑے ہوئے تو اُن کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور سیاہ فام شخص یہ کہتا ہوا نکلا۔

وہ شخص :۔کہاں صاحب میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔

غور سے دیکھتی ہوں، معلوم ہوا کہ فیض علی کا سائیس ہے۔ میں نے اُسے بلایا۔علیحدہ لے جا کے باتیں کیں۔وہ اشرفی اور روپیہ جو بیگم صاحبہ نے انعام دیے تھے چپکے سے اسے دے دیے۔

فضل علی:۔(سرفراز خاں سے) بھائی میں تمہارے ساتھ ہوں اب تم جانو اور یہ لوگ۔

سرفراز:۔ میں ان لوگوں کو ابھی راضی کیے دیتا ہوں مگر یہاں سے چلو۔عورتیں پریشان ہو رہی ہیں، ڈر کر اغش میں پڑی ہیں۔ ذرا ان کو ہوش میں آنے دو، ہم تم لوگوں کو خوش کر دیں گے۔

ڈاکو وہاں سے چلے گئے۔ بیگم صاحبہ ابھی تک بے ہوش پڑی تھیں۔ دانت بیٹھ گئے۔ میں تالاب سے ہاتھ میں پانی لائی۔ان کے منہ پر چھینٹے دیے۔بڑی مشکل سے ہوش میں آئیں۔ میں نے کہا سنبھل کے بیٹھیے۔خدا کے صدقہ سے وہ آفت ٹل گئی۔خاطر جمع رکھیے۔اور عورتوں کو بھی پانی چھڑک کے اٹھایا۔سب اٹھ کے بیٹھیں۔ جب اطمینان ہو گیا تو میں نے کل واقعہ بیان کیا۔بیگم صاحبہ بہت خوش ہوئیں سرفراز خان کو بلا بھیجا۔

سرفراز:۔سرکار کچھ دیجیے بغیر اس کے کام نہ چلے گا۔اس وقت نہ امراؤ جان یہاں ہوتیں نہ یہ آفت ٹلتی۔

میں:۔(میں نے اس بات کا جواب کچھ نہ دیا اس لیے کہ میں سمجھ گئی کہ اس وقت میں یہ راز کی بات ان کے منہ سے نکل گئی ہے اس موقع پر ایسی باتوں کا اظہار ان کی شان کے خلاف ہے) جی نہیں! میں نے کیا کیا، یہ بھی اتفاق تھا مختصر یہ کہ بیگم نے صندوقچہ منگایا۔پانچ سو نقد اور کچھ سونے چاندی کا زیور دے کے انھیں ٹالا۔سب کی جان میں جان آئی۔بیگم کا اس وقت کا کہنا مجھے آج تک یاد ہے۔

بیگم:۔ کیوں امراو جان باغ میں رہنے کا مزہ دیکھا؟

میں:۔حضور سچ کہتی تھیں۔

اب صبح کے تین بج گئے تھے۔ سب لوگ اٹھ اٹھ کے کوٹھی میں گئے۔ ان لوگوں کے ساتھ میں بھی اٹھی۔ کوٹھی کے برآمدے میں ایک پلنگ میرے لیے بچھوادیا گیا۔ نیند کسے آتی ہے رات بھر جاگتی رہی۔ صبح سب سوگئے، میری آنکھ بھی لگ گئی۔ ابھی ٹھیک سے سونے نہ پائی تھی کہ میرے خدمت گار سواری لے کے آگئے۔ مجھے جگوایا۔ میں آنکھیں ملتی ہوئی باہر گئی۔

خدمتگار:۔ آپ تو خوب یہاں آئیں۔ رات بھر ہم لوگ راہ دیکھا کیے۔

میں:۔ کیونکر آتی سواری کو تو رخصت کر دیا تھا۔

خدمتگار:۔ اچھا تو اب چلیے، لکھنؤ سے لوگ آپ کے پاس آئے ہیں۔

میں سمجھ گئی ہو نہ ہو بوا حسینی اور گوہر مرزا ہوں گے۔ آخر پتہ لگا لیا نہ؟

میں:۔ اچھا چلتی ہوں سواری لائے ہو؟

خدمتگار:۔ حاضر ہے۔

جب میں نے جانے کا قصد کیا۔ دو ایک عورتیں اور جاگ چکی تھیں۔ مجھ کو روکا کہ بیگم صاحبہ سے مل کے جایئے گا۔ میں نے کہا اس وقت کام ہے بیگم صاحبہ خدا جانے کب سو کے اٹھیں گی۔ ایسا ہی ہے تو پھر آؤں گی۔

گھر پر جو آ کے دیکھتی ہوں بوا حسینی اور میاں گوہر مرزا بیٹھے ہوئے ہیں۔ بوا حسینی میرے گلے سے لپٹ گئیں، رونے لگیں میں بھی رونے لگی۔

بوا حسینی:۔ اللہ بیٹی کیا سخت دل کر لیا۔ تمھیں کسی کی محبت ہی نہیں۔

میں بجائے خود شرمندہ تھی۔ جواب کیا دیتی جھوٹ موٹ رونے لگی۔

معمولی گفتگو کے بعد بوا حسینی نے اسی دن لکھنؤ چلنے کا ارادہ کر دیا۔ میں نے لاکھ لاکھ اصرار کیا ٹھہر جاؤ۔ انھوں نے نہ مانا۔ زیادہ عجلت کی وجہ یہ تھی کہ مولوی

صاحب بیمار تھے، بوا حسینی کو دم بھر کہیں کا ٹھہرنا شاق تھا۔ ایسی ہی میری محبت تھی جو چلی آئی تھیں۔ دو دن کانپور سے اسباب وغیرہ خرید نے اور مکان کے کرایے اور نوکروں چاکروں کے حساب کرنے میں تمام ہوا۔ پوری شکرم کرایہ پر کرلی تھی۔ ضروری اسباب اس پر لادلیا اور فضول سامان نوکروں کو دے دیا۔ دوسرے دن لکھنؤ پہنچ گئی۔ پھر وہی آب و دانہ ہے، وہی مکان، وہی کمرہ، وہی آدمی،

دشتِ جنوں کے سیر میں بہلا ہوا تھا دل
زنداں میں لائے پھر مجھے احباب گھیر کے

دیکھیے پہنچے کہاں تک شورشِ دل کا اثر
صرصرِ وحشت کا یہ شعلہ ہے بھڑ کایا ہوا

نواب ملکہ کشور کی سرکار میں سوز خوانی کا سلسلہ انتزاع السلطنت کے زمانہ تک رہا۔ اسی اثناء میں شہزادے مرزا سکندر حشمت جرنیل صاحب کے مجرائیوں میں میرا بھی اسم ہو گیا تھا۔ جناب عالیہ اور جرنیل صاحب کلکتہ چلے گئے۔ وہ تعلق منقطع ہو گیا۔

جس زمانے میں مرزا برجیس قدر کو مسندِ ریاست پر بٹھایا میں بہ لحاظ قدامت اور اس وجہ سے بھی میرا نام شاہی محلات میں اکثر کی زبان پر تھا مبارکباد دینے کے لیے طلب ہوئی۔ شہر میں ایک اندھیر تھا۔ آج اس کا گھر لٹا کل وہ گرفتار ہوا، پرسوں اس کے گولی لگی۔ چاروں طرف قیامت کا سامان نظر آتا تھا۔ سید قطب الدین نامی ایک صاحب افسرانِ فوج میں تھے، اُن کا تعین درِ دولت پر تھا۔ میرے حال پر بہت عنایت کرتے تھے۔ اس لیے اکثر وہیں رہنا پڑتا تھا۔ مجرے کے لیے بھی وقت بے

وقت طلب ہو جاتی تھی۔

اس چند روزہ حکومت کے زمانہ میں برجیس قدر کے گیارھویں سال کی سالگرہ کا جلسہ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اس جلسہ میں کشمیریوں نے یہ غزل گائی تھی

غیرتِ مہتاب ہے برجیس قدر

گوہر نایاب ہے برجیس قدر

میں نے ایک غزل اس موقع کے لیے تصنیف کی تھی اُس کا مطلع یہ ہے۔

دل ہزاروں کے تری بھولی ادائیں لیں گی

حسرتیں چاہنے والوں کی بلائیں لیں گی

رسوؔا:۔ امراؤ جان تم نے مطلع تو قیامت ہی کا کہا ہے اور کوئی شعر یاد ہو تو پڑھو۔

امراؤ:۔ گیارہ شعر کہے تھے مگر آپ کے سر کی قسم سوا اس مطلع کے اور کوئی شعر یاد نہیں۔ وہ زمانہ ایسی آفت کا تھا۔ نگوڑی دن رات جان دھڑکے میں رہتی تھی۔ غزل ایک پرچہ پر لکھ لی تھی۔ جس دن تک بیگم صاحب قیصر باغ سے نکلی ہیں وہ پرچہ میرے پاندان میں تھا۔ پھر جب وہاں سے نکلنا ہوا ہوں۔ جو لے میں پاندان کیسا جوتیاں اور دوپٹے تک چھوٹ گئے۔

رسوؔا:۔ بھلا کچھ یاد ہے کس دن بیگم صاحب قیصر باغ سے نکلی تھیں؟

امراو:۔ دن تو یاد نہیں۔ ہزاری روزے کے دوسرے یا تیسرے دن۔

رسوؔا:۔ ہاں تمہیں یاد رہا۔ رجب کی انتیسویں تاریخ تھی بھلا فصل کون سی تھی؟

امراو:۔ اخیر جاڑے تھے نوروز کے چار یا پانچ دن باقی رہے ہوں گے۔

رسوؔا:۔ بالکل درست، مارچ کی سولھویں تاریخ تھی۔ اچھا تم بیگم صاحب کے ساتھ قیصر باغ سے نکلیں۔

امراو:۔ جی ہاں! لونڈی تک ہمراہ گئی۔ راستہ میں نمک حرام اور بزدل افسران فوج

کے غمزے اور بیگم صاحب کی خوشامد عمر بھر نہ بھولے گی۔ ایک صاحب کہتے ہیں ''لو صاحب ان کے راج میں ہم پیدل چلیں۔'' دوسرے صاحب فرماتے ہیں ''بھلا کھانے کا تو انتظام درست ہوتا۔'' تیسرے صاحب قیم کو پیٹ رہے تھے۔ چوتھے

اپنی جان کو رو رہے تھے کہ حقہ وقت پر نہیں ملتا۔ جب بہرائچ سے انگریزی فوج نے بونڈی پر حملہ کیا ہے اس میں سید قطب الدین مارے گئے۔ بیگم صاحب نیپال کی طرف روانہ ہوئیں، میں اپنی جان بچا کے فیض آباد چلی آئی۔

رسوا:۔ سنا ہے بونڈی میں چار دن کے لیے خوب چہل پہل ہو گئی تھی؟

امراو:۔ آپ نے سنا ہے میں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لکھنؤ کے بھاگے ہوئے سب وہیں جمع ہو گئے تھے۔ بونڈی کا بازار لکھنؤ کا چوک معلوم ہوتا تھا۔

رسوا:۔ اچھا اس قصہ سے مجھ کو زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ یہ کہیے کہ وہ مال جو آپ نے میاں فیضو سے لیا تھا اس کا کیا حشر ہوا؟

امراو:۔ (ایک آہ بھر بھر کے) اے ہے یہ نہ پوچھیے۔

رسوا:۔ غدر میں سب لوٹ لیا؟

امراو:۔ غدر میں لٹ جاتا تو اتنا افسوس نہ ہوتا۔

رسوا:۔ پھر کیا ہوا؟

امراو:۔ سارا قصہ دہرانا پڑا۔ اس دن شب کو فیضو کے ساتھ بھاگنے والی تھی، میں نے کل زیور اور اشرفیاں ایک پٹاری میں بند کیں اوپر سے خوب کپڑا لپیٹ دیا۔

خانم کے مکان کے پچھواڑے ایک میر صاحب رہتے تھے۔ امام باڑے کے کوٹھے کی دیوار پر چڑھ جاؤ تو ان کے مکان کا سامنا ہو جاتا تھا۔ میں اکثر چارپائی لگا کے اس دیوار پر چڑھ جایا کرتی تھی اور میر صاحب کی بہن سے باتیں کیا کرتی تھی۔

وہ زیور کی پٹاری نے ان کی بہن کے پاس پھینک دی اور ان سے ہاتھ جوڑ

کے کہا اس کو حفاظت سے رکھنا۔ انھوں نے فیض آباد سے آنے کے بعد وہ پٹاری اسی طرح گوڈر میں لپٹی ہوئی میرے حوالے کردی۔ غدر میں تمام دنیا کے گھر لٹے۔ اگر کہہ دیتیں کہ لٹ گئی تو میں ان کا کیا کرلیتی مگر واہ ری بیوی ایک حبہ تک کا نقصان نہیں ہوا۔ ایسے ہی لوگوں سے زمین و آسمان تھنبا ہوا ہے نہیں تو کب کی قیامت آجاتی۔

رسوا: ۔بھلا کتنے کا مال ہوگا۔

امراو: ۔البتہ کوئی دس پندرہ ہزار کا مال تھا۔

رسوا: ۔اور اب کیا ہوا؟

امراو: ۔کیا ہوا۔ جس راہ آیا تھا اسی راہ گیا۔

رسوا: ۔مگر لوگ تو مشہور کرتے ہیں کہ تمہارا ایک حبہ بھی غدر میں نہیں لٹا۔ سب مال تمہارے پاس ہے۔

امراو: ۔اگر مال ہوتا تو ان حالوں میں رہتی جیسی اب رہتی ہوں۔

رسوا: ۔لوگ کہتے ہیں تم نے اپنا بھگل نکالا ہے اگر نہیں ہے تو خرچ کہاں سے چلتا ہے۔ اب بھی کچھ برے حالوں نہیں رہتیں۔ دو آدمی نوکر ہیں، خوش خوراک اور خوش پوشاک بھی ہو۔

امراو: ۔خدا رزاق ہے، جو جس کا خرچ ہے وہ اس کو ضرور ملتا ہے، اس مال کا تو ایک حبہ بھی نہیں رہا۔

رسوا: ۔اچھا تو پھر کیا ہوا؟

امراو: ۔اب کیا بتاؤں ایک مہربان.....

رسوا: ۔میں سمجھ گیا یہ گوہر مرزا صاحب کی حرکت ہوگی؟

امراو: ۔میں اپنے منہ سے نہیں کہتی۔ شاید آپ کا قیاس غلط ہو۔

رسوا: ۔بے شک تمہارے عالی ظرف ہونے میں کوئی شبہہ نہیں۔ دیکھیے وہ چین کر رہے ہیں اور تمہیں پوچھتے تک نہیں۔

امراو: ۔مرزا صاحب! رنڈی سے رسم رہا رہا نہ رہا نہ رہا۔اب وہ مجھے کیوں پوچھیں؟

مدت ہوئی کہ ترک ملاقات ہوگئی

رسوا: ۔اب کبھی تشریف بھی لاتے ہیں؟

امراو: ۔وہ کاہے کو تشریف لائیں گے، میں اکثر جایا کرتی ہوں ۔ان کی بیوی سے محبت ہوگئی ہے۔ابھی چار دن ہوئے لڑکے کی دودھ بڑھائی کی تھی تو بلا بھیجا تھا۔

رسوا: ۔جب بھی کچھ دے ہی آئی ہوں گی؟

امراو: ۔جی نہیں! میں کس قابل ہوں جو کسی کو کچھ دوں گی ۔

رسوا: ۔تو وہ مال گوہر مرزا کے کٹے لگا۔

امراو: ۔مرزا صاحب مال کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ہاتھوں کا میل ہے ۔فقط بات رہ جاتی ہے۔اب بھی اپنے پیدا کرنے والے کے قربان جاؤں، کبھی ننگی بھوکی نہیں رہتی۔آپ ایسے قدردانوں کو خدا اسلامت رکھے مجھے کسی بات کی تکلیف نہیں ہے۔

رسوا: ۔اس میں کیا شک ہے وہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں اب بھی سو سے اچھی ہزار سے اچھی ۔واللہ یہ تمہاری نیت کا ثمرہ ہے ۔خدا نے زیارت سے بھی مشرف کیا۔

امراو: ۔جی ہاں! مولا نے سب مرادیں پوری کیں ۔اب یہ تمنا ہے کہ مجھے کربلا پھر بلا بھیجیں۔میری مٹی عزیز ہو جائے ۔مرزا صاحب میں اس ارادے سے گئی تھی کہ پھر کے نہ آؤں گی مگر خدا جانے کیا ہوا تھا کہ لکھنؤ سر پر سوار ہوگیا مگر اب کی اگر خدا نے چاہا جانا ہوگیا تو پھر نہ آؤں گی ۔

سن چکے حال تباہی کا مری اور سنو
اب تمہیں کچھ مری تقریر مزہ دیتی ہے

بونڈی سے بیگم صاحب اور مرزا برجیس قدر نیپال کو روانہ ہوئے۔ سید قطب الدین لڑائی میں مارے مارے جا چکے تھے۔ میں بہ ہزار مشکل فیض آباد آئی۔ پہلے سرا میں اتری۔ پھر ترپولیے کے پاس ایک کمرہ کرایہ کو لے لیا تھا۔ میراثی رکھ لیے، گانا بجانا شروع کر دیا۔

فیض آباد میں رہتے ہوئے اب مجھے چھ مہینے گذر چکے تھے۔ وہاں کی آب و ہوا طبیعت کے بہت موافق ہے۔ دل لگا ہوا ہے، آٹھویں دسویں کوئی نہ کوئی مجرا آ جاتا ہے۔ اسی پر بسر ہے، تمام شہر میں میرے گانے کی دھوم ہے۔ جہاں مجرا ہوتا ہے ہزاروں آدمی ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میرے کمرے کے نیچے لوگ تعریفیں کرتے ہوئے نکلتے ہیں۔ میں دل میں خوش ہوتی ہوں۔ کبھی کبھی خواب و خیال کی طرح بچپن کی باتیں یاد آ جاتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی دل میں ایک جوش سا پیدا ہوتا ہے مگر انتزاعِ سلطنت، غدر، برجیس قدر یہ سب سانحے آنکھوں کے سامنے گزر چکے ہیں۔ کلیجہ پتھر کا ہو گیا ہے۔ ماں باپ کے تصور کے ساتھ ہی یہ خیال آتا ہے، خدا جانے اب کوئی زندہ بھی ہو یا نہ ہو اور اگر ہو تو ان کو مجھ سے کیا مطلب، ہو اور عالم میں ہوں گے اور عالم میں ہوں۔ خون کا جوش سہی مگر کوئی غیرت دار آدمی مجھ سے ملنا گوارا نہ کرے گا۔ اب ان سے ملنے کی کوشش کرنا ان کو رنج دینا ہے۔ گھر کا خیال آتے ہیں وہ باتیں یاد آتی تھیں پھر طبیعت اور طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔

لکھنؤ کی یاد اکثر ستاتی تھی مگر جب انقلاب کا خیال آتا تھا۔ دل بھر جاتا تھا اب وہاں کون ہے کس کے لیے جاؤں۔ خانم جیتی ہیں تو کیا ہوا۔ ان سے اب کیونکر بنے گی وہی اگلی حکومت جتائیں گی۔ مجھے اب ان کی قید میں رہنا کسی طرح منظور نہ

تھا۔ جو مال میر صاحب کی بہن کے پاس امانت تھا وہ اب کیا ملے گا۔ تمام لکھنؤ لٹ گیا۔ میر صاحب کا گھر بھی لٹ گیا ہوگا، اس کا اب خیال ہی بے کار ہے۔ اگر نہیں لٹا تو ابھی اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میرے ہاتھ لگے جو کچھ موجود ہے وہ کیا کم ہے؟

ایک دن کمرے پر بیٹھی ہوں ایک صاحب شریفانہ صورت ادھیڑ سے تشریف لائے۔ میں نے پان بنا کے دیا۔ حقہ بھروا دیا۔ حالات دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ بہو بیگم صاحبہ کے عزیزوں سے ہیں۔ وثیقہ پاتے ہیں۔ میں نے باتوں باتوں مقبرہ کی روشنی کی تمہید اٹھا کے پرانے ملازموں کا ذکر چھیڑا۔

میں:۔ اگلے نوکروں میں اب کون کون رہ گیا ہے۔

نواب صاحب:۔ اکثر مر گئے۔ نئے نئے نوکر ہیں۔ اب وہ کارخانہ ہی نہیں رہا۔ بالکل نیا انتظام ہے۔

میں:۔ اگلے نوکروں میں ایک بڈھے جمعدار تھے۔

نواب:۔ ہاں تھے تم انھیں کیا جانو؟

میں:۔ غدر سے پہلے میں ایک مرتبہ محرم میں فیض آباد آئی تھی۔ مقبرے پر روشنی دیکھنے گئی تھی انھوں نے میری بڑی خاطر کی تھی۔

نواب:۔ وہی جمعدار نا جن کی ایک لڑکی نکل گئی تھی۔

میں:۔ مجھے کیا معلوم؟ (دل میں) ہائے افسانہ اب تک مشہور ہے۔

نواب:۔ یوں تو کئی جمعدار تھے اور اب بھی ہیں مگر روشنی وغیرہ کا انتظام غدر سے پہلے وہی کرتے تھے۔

میں:۔ ایک لڑکا بھی ان کا تھا؟

نواب:۔ تم نے لڑکے کو کہاں دیکھا؟

میں:۔ اس دن ان کے ساتھ ایسی شکل بھی ملتے کم دیکھی ہے، بن کہے میں پہچان گئی تھی۔

نواب:۔ جمعدار غدر سے پہلے ہی مر گئے، وہی لڑکا ان کی جگہ نوکر ہے۔

اس کے بعد بات کے ٹالنے لیے میں نے اور کچھ حالات اِدھر اُدھر کے پوچھے۔ نواب صاحب نے سوز پڑھنے کی فرمائش کی۔ میں نے دو سوز سنائے۔ بہت محظوظ ہوئے۔ رات کچھ زیادہ آ گئی تھی گھر تشریف لے گئے۔

باپ کے مرنے کا حال سن کے مجھے بہت رنج ہوا۔ اس دن رات بھر رویا کی۔ دوسرے دن بے اختیار جی چاہا بھائی کو جا کے دیکھ آؤں۔ دو دن کے بعد ایک مجرا آ گیا اس کی تیاری کرنے لگی۔ جہاں کا مجرا آیا تھا وہاں گئی محلے کا نام یاد نہیں۔ مکان کے پاس ایک بہت بڑا پرانا املی کا درخت تھا اسی کے نیچے نمگیرا تانا گیا تھا۔ گرد قناتیں تھیں۔ بہت بڑا مجمع مگر لوگ کچھ ایسے ہی ویسے تھے۔ قناتوں کے پیچھے اور سامنے کھپریلوں میں عورتیں تھیں۔ پہلا مجرا کوئی نو بجے شروع ہوا۔ بارہ بجے تک رہا۔ اس مقام کو دیکھ کے وحشت سی ہوتی تھی۔ دل اڈا چلا آتا تھا کہ یہیں میرا مکان ہے۔ یہ املی کا درخت وہی ہے جس کے نیچے میں کھیلا کرتی تھی جو لوگ محفل میں شریک تھے ان میں سے بعض آدمی ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے میں نے ان کو کہیں دیکھا ہے۔ شبہ مٹانے کے لیے قناتوں کے باہر نکلی۔ گھروں کی قطع کچھ اور ہی ہو گئی تھی۔ اس سے خیال ہوا شاید یہ وہ جگہ نہ ہو۔ ایک مکان کے دروازے کو غور سے دیکھا کی۔ دل کو یقین ہوا کہ یہی میرا مکان ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مکان میں گھسی چلی جاؤں، ماں کے قدموں پر گروں وہ گلے لگا لیں گی۔ مگر جرات نہ ہوتی تھی۔ اس لیے کہ میں جانتی ہوں کہ دیہات میں رنڈیوں سے پرہیز کرتے ہیں۔

دوسرے باپ بھائی کی عزت کا خیال تھا۔ نواب صاحب کی باتوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ جمعدار کی لڑکی کا نکل جانا لوگوں کو معلوم ہے۔ پھر جی کہتا ہے ہائے کیا غضب ہے صرف ایک دیوار کی آڑ ہے۔ اُدھر میری اماں بیٹھی ہوں گی اور میں یہاں ان کے لیے تڑپ رہی ہوں، ایک نظر صورت دیکھنا بھی ممکن نہیں، کیا

مجبوری ہے؟

اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ ایک عورت نے آ کے پوچھا۔ ’’تمہیں لکھنؤ سے آئی ہو؟‘‘

میں:۔ہاں! اب تو میرا کلیجہ ہاتھوں اچھلنے لگا۔

عورت:۔اچھا تو ادھر چلی آؤ۔ تمہیں کوئی بلاتا ہے۔

میں:۔اچھا۔ کہہ کہ اس کے ساتھ چلی، ایک ایک پاؤں گویا سو سو من کا ہو گیا تھا۔ قدم رکھتی تھی پڑتا کہیں تھا۔

وہ عورت اس مکان کے دروازے پر مجھ کو لے گئی جسے میں اپنا مکان سمجھے ہوئے تھی، اس مکان کی ڈیوڑھی میں مجھ کو بٹھا دیا اندر کے دروازے پر ٹاٹ کا پردا پڑا ہوا تھا اس کے پیچھے دو تین عورتیں آ کے کھڑی ہوئیں۔

ایک:۔لکھنؤ سے تمہیں آئی ہو؟

میں:۔جی ہاں!

دوسری:۔تمہارا نام کیا ہے؟

میں:۔(جی میں تو آیا کہہ دوں امیرن مگر دل کو تھام کے) امراؤ جان۔

پہلی:۔تمہارا وطن خاص لکھنؤ ہے۔

میں:۔(اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ آنسو نکل پڑے) اصلی وطن تو یہی ہے جہاں کھڑی ہوں۔

پہلی:۔تو کیا بنگلے کی رہنے والی ہو؟

میں:۔(آنکھوں سے آنسو برابر جاری تھے بمشکل جواب دیا) جی ہاں۔

دوسری:۔کیا تم ذات کی پتریا ہو؟

میں:۔ذات کی پتریا تو نہیں ہوں تقدیر کا لکھا پورا کرتی ہوں۔

پہلی:۔(خود رو کے) اچھا تو روتی کیوں ہو۔ آخر کہو پھر تم کون ہو؟

میں :۔(آنسو پونچھ کے) کیا بتاؤں کون ہوں، کچھ کہتے بن نہیں پڑتا۔

اتنی باتیں میں نے بہت دل سنبھال کے کی تھیں۔ اب بالکل تابِ ضبط نہ تھی۔ سینے میں دم رکنے لگا تھا۔

اتنے میں دو عورتیں پردے کے باہر نکلیں ایک کے ہاتھ میں چراغ تھا اس نے میرے منہ کو ہاتھ سے تھام کے کان کی لو کے پاس غور سے دیکھا اور یہ کہہ کے دوسری کو دکھایا اور کہا۔ ''کیوں ہم نہ کہتے تھے وہی ہے۔''

دوسری :۔ ہائے میری امیرن کہہ کے لپٹ گئی۔ دونوں ماں بیٹیاں چیخیں مار مار کے رونے لگیں، ہچکیاں بندھ گئیں۔ آخر دو عورتوں نے آ کے چھڑایا۔ رات ہم دونوں وہیں بیٹھے رہے۔ صبح ہوتے ہی رخصت ہوئی۔ ماں نے چلتے وقت جس حسرت بھری نگاہ سے مجھے دیکھا تھا وہ نگاہ مرتے دم تک مجھے نہ بھولے گی مگر مجبوری۔ روز روشن نہ ہونے پایا تھا کہ سوار ہو کر اپنے کمرے پر چلی آئی۔ دوسرا مجرا صبح کو ہوتا مگر میں نے گھر پر آ کے کل روپیہ مجرے کا واپس کر دیا اور بیماری کا بہانہ کہا بھیجا۔ دولھا کے باپ نے آدھا روپیہ پھیر دیا۔ اس دن، دن بھر جو میرا حال رہا خدا ہی پر خوب روشن ہے۔ کمرے کے دروازے بند کر کے دن بھر پڑی رویا کی۔

دوسرے دن شام کو کوئی دو گھڑی رات گئے ایک جوان سا آدمی سانولی رنگ کوئی بیس بائیس کا سن پگڑی باندھے سپاہیوں کی ایسی وردی پہنے، میرے کمرے پر آیا، میں نے حقہ بھروا دیا۔ پاندان میں پان نہ تھے ماما کو بلا کے چپکے سے کہا، پان لے آؤ۔ اتفاق سے اور کوئی بھی اس وقت نہ تھا۔ کمرے میں میں ہوں اور وہ ہے۔

جوان :۔ کل تمہیں مجرے کو گئی تھیں؟ یہ اس تیور سے کہا کہ میں جھجک گئی۔

میں :۔ ''ہاں'' اتنا کہہ کے اس کے چہرے کی طرف جو دیکھا یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔

جوان :۔ (سر نیچا کر کے) خوب گھرانے کا نام روشن کیا۔

میں:۔(اب سمجھی کہ یہ کون شخص ہے)اس کو تو خدا ہی جانتا ہے۔

جوان:۔ہم تو سمجھے تھے تم مر گئیں مگر تم اب تک زندہ ہو!

میں:۔بے غیرت زندگی تھی نہ مری۔خدا کہیں جلد موت دے۔

جوان:۔بے شک اِس زندگی سے موت لاکھ درجہ بہتر تھی۔تمہیں تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا تھا۔کچھ کھا کے سو رہی ہوتیں۔

میں:۔خود اتنی سمجھ میں نہ تھی، نہ آج تک کسی نے یہ نیک صلاح دی۔

جوان:۔اگر ایسی ہی غیرت دار ہوتیں تو اس شہر میں کبھی نہ آتیں اور آئی بھی تھیں تو تمہیں اس محلے میں مجرے کو نہ آنا تھا جہاں کی رہنے والی تھیں۔

میں:۔ہاں اتنی خطا ضرور ہوئی مگر مجھے کیا معلوم تھا؟

جوان:۔اچھا اب تو معلوم ہو گیا؟

میں:۔اب کیا ہوتا ہے؟

جوان:۔(بہت ہی غصہ ہو کے)اب کیا ہوتا ہے۔اب(چھری کمر سے نکال کے مجھ پر جھپٹا)دونوں ہاتھ پکڑ کے گلے پر چھری رکھ دی)یہ ہوتا ہے۔

اتنے میں ماما بازار سے پان لے کے آئی۔اس نے جو یہ حال دیکھا لگی چیخنے، ''ارے دوڑو بیوی کو کوئی مارے ڈالتا ہے۔''

جوان:۔(چھری گلے سے ہٹا کے ہاتھ چھوڑ دیے)عورت کو کیا ماروں اور عورت بھی کون بڑی..........

اتنا کہہ کے ڈاڑھیں مار مار کے رونے لگا۔

میں پہلے ہی رو رہی تھی۔جب اس نے گلے پر چھری رکھی تھی جان کے خوف سے ایک دھچکا سا کلیجے پر پہونچا تھا اس سے دم بخود ہو گئی تھی۔جب وہ چھوڑ کر رونے لگا میں بھی رونے لگی۔

ماما نے دو ایک چیخیں ماری تھیں۔جب اس نے یہ حال دیکھا کچھ چپ سی ہو

رہی ادھر میں نے اشارہ سے منع کیا ایک کنارے کھڑی ہوگئی۔

جب دونوں خوب رو دھو چکے۔

جوان:۔(ہاتھ جوڑ کے) اچھا تو اس شہر سے کہیں چلی جاؤ۔

میں:۔کل چلی جاؤں گی مگر ایک مرتبہ ماں کو اور دیکھ لیتی۔

جوان:۔بس اب دل سے دور رکھو۔معاف کرو۔کل اماں نے تمہیں گھر پر بلا لیا، میں نہ ہوا نہیں تو اسی وقت وارا نیارا ہو جاتا۔ محلے بھر میں چرچے ہو رہے ہیں۔

میں:۔تم نے دیکھ لیا، جان سے تو میں ڈرتی نہیں۔مگر ہائے تمہاری جان کا خیال ہے۔تم اپنے بچوں پر سلامت رہو۔خیر اگر جیتے رہے تو کبھی نہ کبھی خیر و عافیت سن ہی لیا کریں گے۔

جوان:۔برائے خدا کسی سے ہمارا ذکر نہ کرنا۔

میں:۔اچھا

وہ جوان تو اٹھ کے چلا گیا، میں اپنے غم میں مبتلا تھی۔ ماما نے اور جان کھانا شروع کی۔

ماما:۔یہ کون تھے؟

میں:۔رنڈی کے مکان پر ہزاروں آدمی آتے ہیں۔کوئی تھے تمہیں کیا۔

بہر طور ماما کو ٹال دیا۔رات سو رہی صبح کو اٹھ کے لکھنؤ کے چلنے کی تیاری کی۔ شاموں شام شکرم کرایہ کر کے روانہ ہوگئی۔

لکھنؤ میں آ کر خانم کے مکان میں اتری۔ وہی چوک، وہی کمرہ، وہی ہم ہیں۔اگلے آنے والوں میں سے کچھ لوگ کلکتہ چلے گئے تھے۔کچھ اور شہروں میں نکل گئے تھے۔شہر میں نیا انتظام نئے قانون جاری تھے۔آصف الدولہ کے امام باڑے میں قلعہ تھا۔چاروں طرف دھس[1] بنے ہوئے تھے۔ جا بجا چوڑی چوڑی سڑکیں نکل رہی تھیں۔گلیوں میں کھرنجے بنائے جاتے تھے، نالیاں صاف کی جاتی تھیں غرضکہ

لکھنؤ اور ہی کچھ ہو گیا تھا۔

میں دو چار مہینے خانم کے مکان پر رہی اُس کے بعد بہ لطائف [2] الحیل ایک علیحدہ کمرہ لے کر رہنا شروع کیا۔ زمانے کے انقلاب کے ساتھ خانم کی طبیعت بھی کچھ بدل گئی تھی۔ مزاج میں ایک قسم کے بے پروائی سی ہوگئی تھی۔ جو رنڈیاں نکل کے علیحدہ ہو گئی تھیں ان کا تو ذکر کیا جو ساتھ رہتی تھیں ان کے روپے پیسے سے کوئی واسطہ وغرض نہ تھی۔ میرا علیحدہ ہو جانا بھی کچھ ان کے مزاج کے خلاف نہ گذرا۔ دوسرے تیسرے دن میں بھی جاتی تھی سلام کر کے چلی آتی تھی۔ اسی زمانہ میں نواب محمود علی خاں صاحب سے مجھ سے تپاک بڑھا۔ پہلے کچھ دنوں تشریف لایا کیے پھر نوکر رکھا اس کے بعد مجھے پابند کرنا چاہا۔ بھلا مجھ سے کب ہو سکتا تھا کہ لکھنؤ میں رہوں اور قدیم ملنے والوں سے ملاقات ترک کردوں۔ جب میں نے نواب صاحب کی طبیعت کا یہ رنگ دیکھا، ترک تعلق کرنا چاہا۔ نواب صاحب نے عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا کہ مجھ سے نکاح ہے۔ عجب آفت میں جان پھنسی۔ مقدمہ کی پیروی میں ہزاروں روپے صرف ہوئے۔ عدالتِ ابتدائی میں فیصلہ نواب صاحب کے موافق ہوا۔ اب مجھے روپوش ہونا پڑا۔ مدتوں چھپی چھپی پھری۔ وکیل کی معرفت اپیل کی اپیل میں نواب صاحب ہارے اب ناجائز دھمکیاں دینا شروع کیں، مار ڈالوں گا، ناک کاٹ لوں گا۔ اس زمانہ میں مجھ کو جان کی حفاظت کے لیے دس بارہ آدمی لٹھ بند نوکر رکھنا پڑے۔ جہاں جاتی ہوں آدمی فینس کے ساتھ ہیں ناک میں دم ہو گیا۔ آخر میں نے فوجداری میں مچلکے کا دعویٰ کیا۔ گواہوں سے ثابت کرا دیا کہ نواب صاحب بے شک درپے آزار ہیں۔ حاکم نے نواب صاحب سے مچلکہ لے لیا۔ اب جا کے جان چھوٹی۔ چھ برس تک ان مقدموں میں پھنسی رہی خدا خدا کر کے نجات ہوئی۔

جس زمانہ میں نواب صاحب سے مقدمہ لڑ رہا تھا۔ ایک صاحب اکبر علی

خاں نامی مختار پیشہ چلتے پرزے آفت کے پرکالے ناجائز کارروائیوں میں مشاق، جعل سازی میں استاد، جھوٹے مقدمات بنانے میں وحیدالعصر، عدالت کو دھوکا

دینے میں یکتائے زماں میری طرف سے پیروکار تھے۔ ان کی وجہ سے عدالتی کاموں میں بہت مدد ملتی۔ حق تو یہ ہے کہ اگر وہ نہ ہوتے نواب سے سرکمر نہ ہوتی۔

اگر چہ سچا واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب سے اور مجھ سے نکاح نہ تھا مگر عدالتوں میں اکثر سچی بات کے لیے بھی جھوٹے گواہ پیش کرنا ہوتے ہیں۔ فریق ثانی کی طرف سے بالکل جھوٹا دعویٰ تھا لیکن مقدمہ اس سلیقے سے بنایا گیا تھا کہ کوئی صورت مفر کی نہ تھی۔ نکاح کے ثبوت میں دو مولوی پیش کیے تھے جن کے ماتھوں پر گٹھے پڑے ہوئے، بڑے بڑے عمامے سر پر عبائیں زیب دوش، ہاتھوں میں کنٹھے، پاؤں میں کفشیں، بات بات میں قال اللہ! قال الرسول۔ ان کی صورت دیکھ حاکم عدالت کیا کسی نیک نیت آدمی کو کذب و دروغ کا شبہہ بھی نہیں ہوسکتا۔ ان میں سے ایک بزرگ ناکح کے وکیل بنے تھے اور ایک منکوحے کے مگر پھر حق حق ہے اور ناحق ناحق جرح میں اکھڑ گئے۔ نواب کے اور گواہ ان سے زیادہ بگڑے اور انھیں گواہوں کی گواہی کی وجہ سے نواب اپیل ہار گئے۔ فوجداری میں میری طرف سے جو گواہ پیش کیے گئے تھے وہ سب اکبر علی کے بنائے ہوئے تھے۔ بالکل نہ بگڑے۔

اکبر علی خاں کی آمد و رفت میرے مکان پر بہت زمانہ تک رہی۔ انھوں نے میرے ساتھ پورا حق دوستی ادا کیا۔ ایک حبہ نہیں لیا بلکہ اپنے پاس سے بہت کچھ صرف کیا۔ واقعی ان کو میرے ساتھ ایک قسم کی محبت تھی۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ بُرے آدمی بالکل بُرے نہیں ہوتے کسی نہ کسی سے بھلے ضرور ہوجاتے ہیں۔ اگلے زمانہ کے چوروں کی نسبت آپ نے سنا ہوگا کہ جب کسی سے دوستی کرلیتے تھے تو اس کا پورا نباہ کرتے تھے۔ بغیر کسی قدر بھلائی کے زندگی بسر نہیں ہوسکتی تھی۔ جو شخص سب سے برا ہو وہ کس کا ہو کے رہے گا۔ جب تک نواب سے مقدمہ ہوتا رہا میں کسی

اجنبی شخص کو اپنے پاس نہ آنے دیتی تھی۔ مبادا اُس کا بھیجا ہوا خفیہ خبر لینے آیا ہو اور کسی طرح کا نقصان پہنچائے۔ اکبر علی خاں روزانہ کچہری سے پلٹ کے یہیں آتے تھے۔ شام کو یہیں نماز پڑھتے تھے۔ گھر سے کھانا آتا تھا۔ ہر چند میں نے اصرار کیا کہ مکان سے کھانا منگانے کی کیا ضرورت مگر انھوں نے نہ مانا آخر مجبور ہو کے چپ ہو رہی۔ میرے گھر کے کھانے سے انکار بھی نہ تھا۔ میں بھی انھیں کے ساتھ کھانا کھاتی تھی۔ اس زمانے میں بھی نماز کی پابند ہو گئی تھی۔ اکبر علی خاں کو تعزیہ داری سے عشق تھا۔ رمضان اور محرم میں وہ اس قدر نیک کام کرتے تھے جس سے ان کے سال بھر کے گناہوں کی تلافی ہو جاتی تھی۔ یہ صحیح ہو یا غلط مگر ان کا اعتقاد یہی تھا۔

رسوا:۔ یہ معاملہ ایمان کا ہے اس لیے مجھے اتنا کہہ لینے دیجیے کہ یہ اعتقاد صحیح نہیں ہے۔

امراو:۔ میرے نزدیک بھی ایسا ہی ہے۔

رسوا:۔ عقلمندوں نے گناہوں کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک وہ جن کا اثر اپنی ہی ذات تک رہتا ہے اور دوسرے وہ جن کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے۔ میری رائے ناقص میں پہلی قسم کے گناہ صغیرہ اور دوسری قسم کے گناہ کبیرہ ہیں (اگر چہ اور لوگوں کی رائے اس کے خلاف ہو گی) جن گناہوں کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے اُن کی بخشش وہی لوگ کر سکتے ہیں جن پر اس کا برا اثر پہونچا ہو۔ تم نے خواجہ حافظ کا وہ شعر سنا ہو گا

مے بخور، مصحف بسوز، آتش اندر کعبہ زن

ساکنِ بت خانہ باش و مردم آزاری مکن

امراو جان یاد رکھو۔ مردم آزاری بہت ہی بری چیز ہے اس کی بخشش کہیں نہیں ہے اور اگر اس کی بخشش ہو تو معاذ باللہ خدا کی خدائی بے کار ہے۔

امراو:۔ میرا تو بال بال میاں گہنگار ہے مگر اس سے میں بھی کانپتی ہوں۔

رسوا:۔ مگر تم نے دل آزاری بہت کی ہو گی؟

امراو:۔ پھر یہ تو ہمارا پیشہ ہے، اسی دل آزاری کی بدولت لاکھوں روپے ہم نے کمائے، ہزاروں اُڑائے۔

رسوا:۔ پھر اس کی کیا سزا ہوگی؟

امراو:۔ اس کی کوئی سزا نہ ہونا چاہیے۔ ہم نے جس قسم کی دل آزاری کی اس میں ایک طرح کی لذت ہے جو اُس دل آزاری کا معاوضہ ہو جاتا ہے۔

رسوا:۔ کیا خوب!!

امراو:۔ فرض کیجیے ایک صاحب نے ہم کو میلے تماشے میں کہیں دیکھ لیا، مرنے لگے۔ کوڑی پاس نہیں، ہم بے لیے مل نہیں سکتے۔ ان کا دل دکھتا ہے پھر اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ دوسرے صاحب ہم سے ملنا چاہتے ہیں روپیہ بھی دیتے ہیں ہم ایک اور شخص کے پابند ہیں یا ان سے ملنا نہیں چاہتے۔ اپنا دل۔ اُن کی جان پر بنی ہے پھر؟ ہماری بلا سے؟ بعض صاحب ہمارے پاس اس طرح کے آتے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں چاہو۔ ہم نہیں چاہتے، اجارہ ہے۔ اس سے ان کو صدمہ پہنچتا ہے پھر ہماری پاپوش سے۔

رسوا:۔ یہ سب گولی مارنے کے لائق ہیں مگر برائے خدا کہیں۔ مجھے ان میں سے کسی میں شمار نہ کر لیجیے گا۔

امروا:۔ خدا نہ کرے۔ آپ خوش باشوں میں ہیں نہ آپ کسی کو چاہتے ہیں نہ کوئی آپ کو چاہتا ہے اور پھر آپ سب کو چاہتے ہیں اور سب آپ کو۔

رسوا:۔ یہ کیا کہا؟ ایک بات ہے، نہیں بھی ہے۔ کہیں ایسا ہو سکتا ہے؟

امراو:۔ میں نے منطق تو زیادہ نہیں پڑھی مگر ہو سکتا ہے جب ایک بات کے دو پیرائے ہوں۔ ایک چاہنا عقلمندی کے ساتھ ہوتا ہے اور ایک بے وقوفی کے ساتھ۔

رسوا:۔ اس کی مثال؟

امرواو:۔ پہلے کی مثال جیسے آپ مجھ کو چاہتے ہیں میں آپ کو۔

رسوا:۔خیر میرے چاہنے کا حال تو میرا دل ہی جانتا ہے اور آپ کے چاہنے کا حال آپ کے اقرار سے معلوم ہو گیا۔آگے چلیے دوسری مثال۔

امراو:۔خیر نہیں چاہتے تو میرا برا چاہتے ہوں گے۔دوسرے کی مثال سنیے۔جیسے فریادرس الٰہی۔

رسوا:۔نہیں۔اس مثال میں آپ نے غلطی کی اور کوئی مثال دیجیے۔

امراو:۔اچھا جیسے قیس لیلیٰ کو چاہتا تھا۔

رسوا:۔آپ بھی کیا دقیانوسی خیال ڈھونڈ کے لائی ہیں؟

امراو:۔اچھا جیسے..........نظیر..........

رسوا:۔(بات کاٹ کے) اس مثال سے مثال کیجیے۔اس موقع پر مجھ کو ایک شعر یاد آیا ہے سن لیجیے اور اپنا قصہ دہرائیے۔

کیا کہوں تجھ سے محبت وہ بلا ہے ہمدم
ہم کو عبرت نہ ہوئی غیر کے مر جانے سے

امراو:۔ہاں وہ کلکتہ والا معاملہ

رسوا:۔اتنی دور کہاں پہنچیں۔کیا لکھنؤ میں ایسے نہیں رہتے؟

امراو:۔دنیا خالی نہیں ہے۔

رسوا:۔ہاں میں نے سنا تھا آپ اکبر علی خاں کے گھر بیٹھ گئی تھیں۔

امراو:۔مجھ سے سن لیجیے۔جس زمانے میں نواب عدالتِ ابتدائی سے جیت گئے تھے اور میں روپوش ہوئی ہوں اس زمانہ میں اکبر علی خاں مجھے اپنے مکان لے گئے تھے۔ کئی برس رہنے کا اتفاق ہوا۔اس زمانہ میں تین آدمی اس دھوکے میں تھے کہ میں اکبر علی کے گھر بیٹھ گئی۔ایک تو خود اکبر علی دوسرے ان کی بیوی، تیسرے کا نام نہ بتاؤں گی۔

رسوا:۔میں بتا دوں؟

امراو:۔گوہر مرزا؟

رسوؔا:۔جی نہیں۔

امراو:۔تو پھر اور کون؟ بتائیے۔

رسوؔا:۔آپ بتائیے۔

امراو:۔ایسے فقرے کسی اور کو دیجیے۔

رسوؔا:۔فقرہ کیسا؟ میں ابھی ایک پرچے پر لکھ کے رکھے دیتا ہوں۔پھر آپ بتائیے۔

امراو:۔بہتر۔

رسوؔا:۔پرچہ لکھ کے رکھ دیا۔اب کہیے۔

امراو:۔تیسرے میں خود۔

رسوؔا:۔پرچے میں لکھا تھا ''آپ خود''

امراو:۔واہ مرزا صاحب خوب پہچانا۔

رسوؔا:۔آپ کی عنایت ہے۔ہاں تو کیا گذری؟

امراو:۔گذری کیا، سنیے۔

اول تو انھوں نے مجھے ایک چھوٹے سے مکان میں لے جا کے اتارا جو اُن کے مکان سے ملا ہوا تھا۔کھڑکی درمیان میں تھی۔موا کچا مکان، ایک چھوٹی سی دلنیہ، آگے چھپر، ایک اور چھپر سامنے پڑا ہوا اس میں دو چولھے بنے ہوئے یہ کیا ہے باورچی خانہ۔اور سب خانے بھی ایسے ہی سمجھ لیجیے۔اسی مکان میں بھی رہوں اور میاں کے بے تکلف دوست بھی آیا جایا چاہیں۔ان میں سے ایک صاحب رئیسِ موضع شیخ افضل حسین چھوٹتے ہی بھوجی کہنے لگے۔ان کے بے تکلے پن نے ناک میں دم کر دیا پانوں کی فرمائش سے بتنگ ہو گئی۔ہرٹے بھوجی پان نہ کھلاؤ گی۔''

ایک دن دو دن آخر مروت کہاں تک!! انتہا کی پاندان میں نے اُن کے آگے سرکا دیا۔اس دن سے میں خود دستبردار ہو گئی۔انھوں نے قبضہ کر لیا جیسے کوئی

مال موروثی پر قبضہ کرتا ہے۔ پان اس بدتمیزی سے کھاتے تھے کہ دیکھنے والوں کو خواہ مخواہ نفرت ہو جائے۔ کتھے چونے کی کلھیوں میں انگلیاں پڑ رہی ہیں۔ زبان سے چاٹ رہے ہیں۔ میں نے جب یہ قرینہ دیکھا چکنی کے چورے اور الائچی پر بسر کرنے لگی۔ اس میں بھی وہ ساجھا لگاتے تھے۔ ایک اور صاحب واجد علی نامی اکثر خصوصاً کھانے کے وقت تشریف لاتے تھے۔ اب یاد نہیں کہ اکبر علی خاں کے بردار نسبتی تھے۔ اُن کے مذاق میں فحش حدِ اعتدال سے زیادہ تھا۔

ان دونوں صاحبوں کے سوا اکبر علی خاں صاحب کے بے تکلف احباب بہت سے تھے جن میں سے اکثر کو مقدمہ بازی کا شوق تھا۔ رات دن قانون چھٹا کرتا تھا۔ مگر جب مرزا صاحب تشریف لے جاتے تھے تو اک ذرا امن ہو جاتی تھی۔

اِس مکان سے چند روز کے بعد میری طبیعت حد سے زیادہ اکتا گئی۔ قریب تھا کہ کہیں اور رہنے کا بندوبست کروں کہ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ اکبر علی خاں کسی مقدمہ میں فیض آباد گئے۔ افضل علی اپنے گاؤں اتفاق سے مکان میں کوئی نہیں۔ دروازے کی کنڈی بند کرلی ہے۔ میں اکیلی بیٹھی ہوں کہ اتنے میں کھڑکی جو زنانے مکان کی دیوار میں تھی کھلی اور اکبر علی خاں کی بیوی اندر چلی آئیں۔ مجھے خواہی نخواہی سلام کرنا پڑا۔ انگنائی میں تختوں کا چوکا بچھا ہوا تھا اسی کے پاس میرا پلنگ لگا تھا۔ پہلے بڑی دیر تک چپکی کھڑی رہیں۔ آخر میں نے کہا یا اللہ بیٹھ جایئے۔ بارے بیٹھ گئیں۔

میں:۔ ہم غریبوں پر کیا عنایت تھی آج اِدھر کہاں تشریف آئی؟

بیوی:۔ تم کو میرا آنا ناگوار ہو تو چلی جاؤں۔

میں:۔ جی نہیں آپ کا گھر ہے۔ مجھے ایسا حکم ہو تو مناسب بھی ہے۔

بیوی:۔ لے باتیں نہ بناؤ اگر میرا گھر ہے تو تمہارا بھی گھر ہے اور سچ پوچھو تو نہ میرا ہے نہ تمہارا۔ گھر تو گھر والے کا ہے۔

میں:۔ جی نہیں! خدا رکھے آپ کے گھر والے کو ان کا بھی ہے آپ کا بھی۔

بیوی: ۔تم اکیلی بیٹھتی رہتی ہو آخر ہم بھی آدمی ہیں ادھر کیوں نہیں چلی آتیں ہاں میاں کا حکم نہ ہوگا۔

میں: ۔میاں کے حکم کی تو کچھ ایسی تابع نہیں ہوں، ہاں آپ کی اجازت کی ضرورت تھی وہ حاصل ہوگئی۔اب حاضر ہوں گی۔

بیوی: ۔اچھا تو چلو۔

میں: ۔چلیے۔

مکان میں جا کے جو دیکھتی ہوں خدا کا دیا سب کچھ تھا۔تانبے کے مٹکے، دیگ، لگرے، پتیلیاں، لوٹے، نواڑی کے پلنگ، مسہری، تختوں کے چوکے، فرش و فروش مگر کسی بات کا قرینہ نہیں۔انگنائی میں جا بجا کوڑا پڑا ہوا، باورچی خانہ میں سامنے بوا امیرن کھانا پکا رہی ہیں، مکھیاں بھن بھن کر رہی ہیں، تختوں کے چوکے پر پیک کے چھکتے پڑے ہوئے، بیوی کے پلنگ پر منوں کوڑا۔امامن نے پاندان لا کے بیوی کے سامنے کر دھ دیا۔کتھے چونے کے دھبوں میں سارا پاندان چھپا ہوا تھا دیکھ کے میرا تو جی مالش کرنے لگا۔

بیوی نے پان لگا کے دیا میں نے چٹکی میں دبا لیا۔باتیں کرنے لگی، اسی اثنا میں محلّہ کی ایک بڑھیا آنکلی زمین پر پھسکڑ امار کے بیٹھ گئے۔بیوی سے (میری طرف اشارہ کر کے پوچھا)

بڑھیا: ۔یہ کون ہیں؟

بیوی: ۔اب تمہیں کیا بتاؤں؟

میں چپکی رہی

بڑھیا: ۔(اکبر علی خاں کی بیوی سے)اوئی جیسی میں جانتی نہیں۔

میں: ۔بڑی بی پھر جانتی ہو تو اس کا پوچھنا کیا۔

بڑھیا: ۔اوئی بی تم سے میں بات نہیں کرتی۔ میں تو اپنی بہو صاحب سے پوچھتی

ہوں ۔میرا منہ تم سے بات کرنے کے لائق نہیں ۔تم بڑی آدمی ہو۔

میں بڑھیا کا منہ دیکھ کے چپ ہو رہی۔

بیوی: ۔اوئی بڑھیا! ذرا سی بات میں جھاڑ کا کانٹا ہوگئی ۔

بڑھیا: ۔(بیوی سے)تم تو اس طرح بات چھپاتی ہو جیسے ہم دشمن ہیں، اے ہم تو ان کی بھلائی کے لیے بات کرتے ہیں، یہ ہمیں سے الٹے بگڑتی ہیں۔

بیوی: ۔لے بس اپنی خیر خواہی رہنے دو۔بوا تم کسی کے گھر کی اجارہ دار ہو۔

بڑھیا: ۔ہمارا اجارہ کیوں ہونے لگا۔اب جو نئی نئی آتی جائیں گی ان کا اجارہ ہوتا جائے گا۔

بڑھیا کی اِس بات پر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی منہ پھیر کے ہنسنے لگی۔

بیوی: ۔کیوں نہیں اے تم میری سوت ہو۔(میری طرف مخاطب ہو کے) لے سن لو خاں صاحب کی پہلی یہی ہیں۔لو بیوی تم اصل میں ان کی سوت ہو میں تو ان کے بعد آئی ہوں۔

بڑھیا: ۔سوت ہوں اپنے ہوتے سوتوں کی، مجھے یہ باتیں نہیں اچھی لگتیں ۔منہ در منہ گالیاں دیتی ہو۔موی کسبیوں خانگیوں کی صحبت میں اور کیا سیکھو گی یہی تو سیکھو گی ۔

لو اتنے دن مجھے آتے ہو گئے، بڑی بیگم صاحب (اکبر علی خاں کی والدہ) نے آدھی بات مجھے نہیں کہی ۔بہو صاحب گنوتی ایسی ہیں کہ محلّہ کی بڑھیوں کو گالیاں دیتی ہیں ۔

بیوی: ۔(غصہ ہو کر) میں نے تم سے کہہ دیا ۔لڈن کی ماں تم آج سے میرے پاس نہ آنا وہیں بڑی بیگم صاحب کے پاس جا کے بیٹھا کرو۔

میں: ۔مجھے بہت غصہ تھا مگر میں نے دیکھا کہ بے تکی عورت ہے اِس کے منہ کون لگے ۔ضبط کر کے چپکی ہو رہی ۔

بڑھیا: ۔ہماری بلا آتی ہے۔

بیوی: ۔موئی کی شامتیں آئی ہیں۔ یہ بلا بوغمہ[1] کیا بک رہی ہے؟

بڑھیا: ۔تو کیا تمہارے دبیل ہیں۔ کچھ کسی کے لینے دینے میں نہیں۔ گھڑی بھر نکل آتے تھے۔ ہم تم سے تم ہم سے بات کرتے تھے، نہ آئیں گے۔

بیوی: ۔ہرگز نہ آنا۔

بڑھیا: ۔اس ضد پر تو ضرور آئیں گے دیکھیں تو تم ہمارا کیا بناتی ہو؟

بیوی: ۔آؤ گی تو اتنی جوتیاں لگائیں گے کہ سر میں ایک بال نہ رہے گا۔

بڑھیا: ۔کیا تاکت کیا مجال منہ بنواؤ، جوتیاں ماری گی بڑی بے چاری۔

بیوی: ۔لے اٹھو یہاں سے ٹہلو نہیں تو لیتی ہوں ہاتھ میں جوتی۔

بڑھیا: ۔(ایک ٹھٹھا لگا کر) آج تو ہم جوتیاں کھا کے جائیں گے۔ مارو بڑے باپ کی بیٹی ہو۔

باپ کے نام پر بیوی کو غصہ آ گیا، چہرہ سرخ ہو گیا، تھر تھر کانپنے لگیں۔

بیوی: ۔دور ہو یہاں سے کہتی ہوں۔

بڑھیا: ۔اب تو ہم جوتیاں کھا ہی کے جائیں گے۔

بیوی: ۔(مجھ سے مخاطب ہو کے) دیکھو یہ مجھے ضد دلا رہی ہے۔ بے مارے موئی کو نہ چھوڑوں گی۔

میں: ۔بیگم جانے بھی دیجیے۔ موئی بے تکی ہے۔

بڑھیا: ۔مجھ سے تو کچھ نہ بولنا مال زادی، تجھے کچا ہی کھا جاؤں گی۔

بیوی: ۔(جوتی پیر سے لے کر) ایک دن تین۔ اب راضی ہوئیں۔

میں: ۔بیگم جانے دیجیے (ہاتھ سے جوتی چھین لی)

بیوی: ۔نہیں تم نہ بولو۔ موئی کا کچومر نکال ڈالوں گی۔

بڑھیا: ۔اور مارو۔

بیوی نے دوسرے پیر سے جوتی اتار کر پانچ چار اور لگائیں۔ اب تو بڑھیا

نے زمین پر پاؤں پھیلا دیے اور زمین پر دوہتڑ مارنا شروع کیے۔ ہے ہے! ہے ہے ! مجھے جوتیاں ماریں! اب تیرا دل ٹھنڈا ہوا۔ سوت کی جلن مجھ پر اتاری۔ ہائے مارا! ہائے مارا! چلا چلا کے دوہائی دینا شروع کی۔ باورچی خانے سے بوا امیرن اٹھ کے دوڑیں، بڑی بیگم صاحب اپنے دالان سے چلی آئیں۔ ایک آفت برپا ہوگئی۔ بڑی بیگم صاحب کو آتے دیکھ کر اور بھی دوہتڑ مارنا شروع کیے۔

اس بڑھاپے میں مجھے جوتیاں کھلوائیں۔

بیگم صاحب:۔ لے مجھے کیا معلوم کہ تم پر جوتیاں پڑ رہی ہیں تو آ کے بچا لیتی! آخر بات کیا ہوئی۔

بڑھیا:۔ (میری طرف اشارہ کر کے) اِس مال زادی نے مار کھلوائی! ارے اس نے مار کھلوائی۔

میں ٹھگ ماری سی ہوگئی۔ بیگم صاحب سے مجھ سے اس وقت سامنا ہوا ہے کچھ کہتے نہیں بن پڑتا۔

بیوی:۔ پھر ان کا نام لیے جاتی ہے۔

بڑھیا:۔ ہم تو نام لیں گے تم کیا کرتی ہو؟

بیگم صاحب:۔ آخر ہوا کیا تھا؟

بڑھیا:۔ مجھے نگوڑی ماری نے اتنا پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ لے بھلا کیا گناہ کیا؟

بیوی:۔ تم تو کہتی تھیں میں جانتی ہوں پھر پوچھنے سے کیا مطلب تھا؟

بڑھیا:۔ کیا مطلب تھا۔ اچھا مطلب بتا دوں گی تو سہی جو اپنا عوض نہ لے لوں خیر تم نے مارا تو ہے۔

بیگم:۔ چل شفتل ہتو کیا بدلا لے گی۔ ذرا کسی بھلاوے پر نہ بھولنا۔

بڑھیا:۔ میں تم سے کچھ نہیں کہتی تم جو چاہے کہہ لو تمہارا حک ہے۔

بیگم:۔ تیرے حک والی کی ایسی تیسی۔ نکل یہاں سے۔

بڑھیا:۔لو یہ بھی نکالتی ہوئی آئیں۔اچھا جاتے ہیں۔یہ کہہ کے بڑھیا اٹھ کھڑی ہوئی۔لہنگا جھاڑ جھور بڑ بڑاتی ہوئی۔"بڑی نکالنے والی، جاتے ہیں جاتے ہیں دیکھیں تو کیونکر نہیں آنے دیتیں۔"

بیگم صاحب:۔(بہو سے) آخر تم اس موئی چڑیل کے منہ کیوں لگیں؟

بیوی:۔اماں جان! آپ کے سر کی قسم میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔وہ تو آپ ہی جیسے کوئی کھڑی کھاٹ پر سے سو کے آئی تھی۔سیکڑوں باتیں تو ان بے چاری کو سنا کے رکھ دیں۔

بیگم صاحب میرے ذکر پر کچھ ناک بھوں چڑھا کے چپکی ہو گئیں۔مجھے کو اس بڑھیا کی بات تو ناگوار نہیں ہوئی کیونکہ میں اس کو دیوانی سمجھے ہوئے تھی مگر ہاں بیگم صاحب کے بے اعتنائی سے سخت صدمہ ہوا۔وہ ابھی وہیں کھڑی تھیں کہ میں اٹھ کے کھڑکی کے پاس چلی آئی اور اپنے مکان میں آن بیٹھی۔

بیگم صاحب:۔(میرے چلے آنے کے بعد بہو سے) اوئی بیا! تم نے تو اس بڑھیا نگوڑی کو خواہ مخواہ پیٹ ڈالا۔اور پھر موئی ایک شغل بازاری کے لیے آخر تمہیں اس کی پرچک لینا کیا ضرور تھی۔

امیرن:۔اچھا اس کو جانے دیجیے جیسی اس نے بدزبانی کی تھی اپنی سزا کو پہونچی یہ پوچھیے کہ کسی خانگیوں سے میل جول کیسا اور وہ بھی جس کی میاں سے آشنائی ہو۔ابھی وہ لا کے سر پر بٹھا دیتے تو کیسی مانامت[2] ڈالتی اور خود فرض کر کے جا کے بلا لائیں۔

بیگم صاحب:۔(امیرن سے) اُس کی مجال تھی گھر میں لے آتا، ہم نہیں بیٹھے ہیں؟ باہر جس کا جی چاہے آئے گھر میں کسی کا کیا کام ہے۔اے لو اُن سے (اکبر علی خاں کے باپ سے) برسوں حسین باندی سے ملاقات رہی، اُس نے کیسی منتیں کیں میں نے نہیں ہامی بھری۔بوا امیرن میں یہ سوچی تھی کہ آج کو مہمان طریق کھڑی تڑی

چلی آئے گی کل میاں گھر میں بٹھالیں گے تو یہ چھاتی پر مونگ کون دلوائیگا۔ اپنی پت[1] اپنے ہاتھ ہے یہ آج کل کی لڑکیوں کو اپنے آگم[2] اندیشے کا خیال نہیں۔

امیرن:۔ سچ ہے بیگم صاحب اول تو مونڈھے پر بیٹھنے والیوں کا گھر گرہستیوں میں کام ہی کیا ہے۔ اگلے لوگ کہتے تھے ایک درجہ مرد کو گھر میں بلالے مگر بدعورتوں کو نہ بلائے۔

بیگم صاحب:۔ بوا بات یہ ہے کہ مرد اگر چلا بھی آئے گا تو کیا وہ عورتوں میں گھس کے بیٹھے گا۔ کل کی بات ہے بھاگڑ[3] کے دنوں میں برسوں حسین خاں ہمارے گھر میں چھپے رہے۔ پھر بوا ایک گھر کا رہنا سہنا مگر مجال ہے کہ انھوں نے میرا آنچل تک دیکھا ہو، بات سنی ہو۔ دن دن بھر صحنچی میں گھٹی بیٹھی رہتی تھی۔ ماما اصیلوں سے اشارہ میں باتیں کرتی تھی۔

امیرن:۔ ایک تو یہ کہ تم صحنک[4] کی کھانے والی بیوی صاحب زادی۔ جب ایسوں کے پاس بیٹھوگی کہاں تک بچاؤ ہوگا۔ کہیں اُس نے کتھے چونے کی کلھیوں میں ہاتھ ڈال دیا۔ تمہاری آنکھ بچا کے کٹوری میں پانی پی لیا۔ دوسرے موئی نکاہیاں، ان کا اتبار (اعتبار) کیا۔ سیکڑوں عارضے میں بھری ہوتی ہیں ان کے تو پرچھائیوں سے بچنا چاہیے۔

بیگم صاحب:۔ ایک بات کیا سبھی باتوں کا بچاؤ ہونا چاہیے۔ برچھانواں، ناگھن ٹونے ٹوٹکے، بوا کون کہے، ان کو تو سمجھ نہیں۔ اور جو کچھ کھلا ہی دے۔ مرزا محمد علی کی بہو کو سوت نے جونک کھلادی۔ دین و دنیا سے جاتی رہی نہ آل کی نہ اولاد کی۔

امیرن:۔ جی ہاں! اے لو کیا میں جانتی نہیں ہوں۔

بیگم صاحب:۔ بوا یہ سوتاپے کا رشتہ ایسا ہے کہ اس میں جہاں تک الگ تھلگ رہے اچھا۔ یوں تو الگ تھلگ رہنے پر بھی جان نہیں بچتی۔ مجھی کو دیکھو اُس موئی ٹکے کی

کہاری نے کیا کوئی بات اٹھا رکھی۔ دعا، تعویذ، گنڈے کیسے کیسے نقش میرے سرہانے سے نکلتے تھے۔

امیرن:۔ پھر اس کو اپنے گھر میں آنے دیا؟

بیگم صاحب:۔ اے بوا نوکر تھی میں کیا جانتی تھی کہ اس سے میاں سے لگا سگا ہے۔ جس دن معلوم ہو گیا میں نے کھڑے کھڑے نکال دیا۔

امیرن:۔ مگر بیگم ایک بات کہوں خدا لگتی۔ آپ کی خدمت بہت کی۔

بیگم:۔ یہ خوب کہی۔ میاں کو چھپا تھا اب کیا اس سے بھی گئی گذری۔ اِس بڑھیا کو کیا سمجھتی ہو اس سے بھی کسی زمانہ میں میاں سے تھی۔

امیرن:۔ (قہقہہ لگا کر) نہیں بیگم صاحب۔

بیگم صاحب:۔ کیا میں جھوٹ کہوں گی۔ جب ہی تو دھراتی اٹھی کہ اپنا عوض لے لوں گی۔

امیرن:۔ بہو صاحب! تو پھر آپ کو نہیں چاہیے تھا۔ سسرے کی حرم کو اتنی جوتیاں.......

بیگم:۔ بوا ان لوگوں کو یہ لحاظ کہاں۔ سچ کہوں مجھے بھی یہ بات ناگوار ہوئی۔ ان کے منہ پر کہتی ہوں۔ آج کو موئی ٹکھائی کے چلتے، سسرے کی حرم کے جوتیاں ماریں، کل ساس کو ماریں گی۔

امیرن:۔ نہیں! خدا نہ کرے مگر ہاں بات کہنے ہی میں آتی ہے۔ ان دونوں بڑھیوں نے بہو صاحب بے چاری کو ایسے کونچے دیے کہ آخر کو بے چاری چیخیں مار مار کے رونے لگی۔ میرا حال تھا کہ انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ دونوں بڑھیوں کا منہ نوچ لوں۔

رسوا: ہائیں ہائیں یہ غصہ۔

رو کیے گا ذرا طبیعت کو

امراو:۔مرزا صاحب غصے کی بات ہی تھی۔ایک انسان کو اتنا ذلیل سمجھنا انسانیت سے بعید ہے۔

رسوا:۔میرے نزدیک تو کوئی بات نہ تھی جس پر آپ کو اتنا غصہ آیا وہ دونوں بڑھیاں سچ کہتی تھیں اور مدن کی ماں بھی بے چاری ناحق پٹی۔حق تو یوں ہے اب آپ چاہے برا مانیں چاہے بھلا۔

امراو:۔وہ مرزا صاحب! آپ خوب انصاف کرتے ہیں۔

رسوا:۔جی ہاں! میرے نزدیک انصاف یہی ہے۔اس معاملہ میں آپ بھی ایک حد تک بے قصور تھیں۔سارا قصور اکبر علی خاں کی بیوی کا تھا۔

امراو:۔ان بے چاری کا کیا قصور تھا؟

رسوا:۔ایسا قصور تھا کہ اگر میری بیوی ایسا کرتی تو فوراً ڈولی بلوا کے ان کے میکے بھجوا دیتا اور چھ مہینے تک صورت نہ دیکھتا۔اچھا ایک بات پوچھتے ہیں۔اکبر علی خاں نے جب یہ واردات سنی تو کیا کہا؟

امراو:۔مدن کی ماں پر جب خوب چیخے چلائے۔کہہ دیا خبردار! یہ ڈائن ہمارے گھر میں نہ آنے پائے۔کئی مہینے تک اس کا آنا جانا موقوف رہا۔جب بڑے خاں صاحب آئے تو وہ پھر آنے لگی۔یہ قصہ ان کے آگے چھیڑا گیا وہ الٹے اکبر علی خاں کی بیوی پر خفا ہوئے۔

رسوا:۔بڈھے کی عقل صحیح تھی؟

امراو:۔صحیح تھی یا سٹھیا گئے۔ذرا مدن کی ماں پاؤں دبایا کرتی تھیں، اسی سے اس کی پر چک لیتے تھے۔کیوں نہ پر چک لیتے مدن کی ماں ان کی پرانی آشنا تھی۔

رسوا:۔پھر آپ ہی قائل ہو جیے، یہ عین وضع داری تھی۔اچھا اب ایک بات اور بتا دیجیے مدن کی ماں جوانی میں کوئی رنڈی تھی یا گھر گرست اور بوا امیرن کون تھیں؟

امراو:۔ مدن کی ماں موئی دھنینی تھی۔ جوانی میں خراب ہوگئی تھی۔ بوا امیرن ایک دیہاتی عورت تھیں۔ ان کا مکان سندیلہ کے ضلع میں تھا۔ ایک جوان بیٹا تھا۔ وہ بھی بڑے خاں صاحب کے پاس نوکر تھا۔ ایک لڑکی تھی وہ کہیں باہر بیاہی ہوئی تھی۔

رسوا:۔ پورے واقعات آپ کے بیان سے مجھ کو معلوم ہوگئے۔ اب پوچھیے آپ کیا پوچھتی ہیں؟

امراو: تو کیا کوئی مقدمہ آپ فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں؟

رسوا:۔ بات یہ ہے کہ عورتیں تین طرح کی ہوتی ہیں ایک نیک بختیں، دوسری خرابیں تیسری بازاریاں اور دسرے قسم کی عورتیں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں ایک تو وہ جو چوری چھپے عیب کرتی ہیں، دوسری وہ جو کھلم کھلا بدکاری پر اتارو ہو جاتی ہیں۔ نیک بختوں کے ساتھ صرف وہی عورتیں مل سکتی ہیں جو بدنام نہ ہوگئی ہوں۔ کیا تمھیں اتنی سمجھ نہیں ہے کہ وہ بے چاریاں جو تمام عمر چار دیواریوں میں قید رہتی ہیں، ہزار ہا قسم کی مصیبتیں اٹھاتی ہیں۔ اچھے وقت کے تو سب ساتھی ہوتے ہیں مگر برے وقت میں یہ بے چاریاں ساتھ دیتی ہیں۔

جس زمانے میں ان کے شوہر جوان ہوتے ہیں، دولت پاس ہوتی ہے تو اکثر باہر والیاں مزے اڑاتی ہیں مگر مفلسی اور بڑھاپے کے زمانے میں کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ اُن وقتوں میں وہی طرح طرح کی تکلیفیں اٹھاتی ہیں اور بروں کی جان کو صبر کرتی ہیں پھر کیا انھیں اس کا کوئی فخر نہ ہوگا۔ یہی فخر اس کا باعث ہوتا ہے کہ وہ خراب عورتوں کو بہت ہی بری نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ تو بہ استغفار سے خدا گناہ معاف کر دیتا ہے مگر یہ عورتیں کبھی نہیں معاف کرتیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ گھر کی عورت کیسی ہی خوبصورت، خوب سیرت اور خوش سلیقہ کیوں نہ وہ، بے وقوف مرد بازاریوں پر جو اُن سے صورت اور دوسری صفتوں میں بدرجہا بدتر ہیں فریفتہ ہو کر انھیں عارضی طور سے یا مدت العمر کے لیے ترک کر دیتے ہیں اس

لیے اُن کو گمان کیا بلکہ یقین ہے کہ یہ کسی قسم کا جادو ٹونا ایسا کر دیتی ہیں جس سے مرد کی عقل میں فتور آ جاتا ہے یہ بھی ان کی ایک قسم کی نیکی ہے اس لیے کہ وہ اس حال میں اپنے مردوں کو الزام نہیں دیتیں بلکہ بدکار عورتوں ہی کو مجرم ٹھہراتی ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی محبت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

امراؤ:۔ یہ تو سب صحیح ہے مگر مرد کیوں ایسے بے وقوف بن جاتے ہیں؟

رسوا:۔ اس کی وجہ یہ کہ انسان کے مزاج میں جدت پسندی ہے، ایک حالت میں زندگی بسر کرنے سے خواہ وہ کسی ہی عمدہ کیوں نہ ہو، طبیعت اکتا جاتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی کا تغیر اس کی حالت زندگی میں پیدا ہو۔ شاید زنِ بازاری کے ساتھ معاشرت کرنے میں اسے ایک قسم کی نئی لذت ملتی ہے؟ جو کبھی اسکے خیال میں نہ تھی یہاں بھی ایک ہی کے تعارف پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ جدت کی تلاش میں روز نئے کمروں پر پہونچتا ہے اور نئے گھر دیکھتا پھرتا ہے۔

امراؤ:۔ مگر سب مرد ایسے نہیں ہیں۔

رسوا:۔ ہاں اس کی وجہ یہ ہے کہ حسنِ معاشرت کے قانون نے اس کو معیوب قرار دیا ہے۔ جو شخص ایسا کرتے ہیں ان کے عزیز و اقارب دوست احباب ملامت کرتے ہیں۔ اس خوف سے اکثر جرأت نہیں ہوتی مگر جب اخوان الشیاطین کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے، وہ طرح طرح کی لذتوں کا ذکر کر کے ایک عجیب قسم کا شوق ان کی طبیعت میں پیدا کر دیتے ہیں اس لیے وہ خوف ان کے دل میں نکل جاتا ہے۔ آپ کو اس بات کا اچھی طرح کا اندازہ ہوا ہوگا کہ جو لوگ پہلے پہل رنڈی کے مکان پر جاتے ہیں اُن کو اخفائے راز کا کس قدر خیال ہوتا ہے کوئی دیکھتا نہ ہو، کوئی سن نہ لے، دو آدمیوں کے سامنے تو بولنے کا کیا ذکر تخلیہ میں بھی منہ سے بات نہیں نکلتی مگر رفتہ رفتہ یہ حالت بالکل زائل ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ چند ہی روز میں پورے بے غیرت ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر کیا ہے دن دہاڑے سرِ چوک رنڈیوں کے کمروں پر

کھٹ کھٹ کر کے چڑھ جاتے ہیں۔ گاڑی میں کھڑکیاں کھول کر ساتھ بیٹھ کر سیر کرنا، ہاتھ میں ہاتھ، لے کے میلے تماشوں میں لیے پھرنا، ان سب باتوں کو فخر سمجھنے لگتے ہیں۔

امراو: ۔یہ تو صحیح ہے مگر شہروں میں ان باتوں کو چنداں معیوب نہیں سمجھتے۔

رسوا: ۔خصوصاً دہلی اور لکھنؤ میں، اور یہی ان شہروں کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوا۔ دیہات اور قصبات میں ایسے شریر لوگوں کی صحبت کم ملتی ہے جو نوجوانوں کو ان بدکاریوں پر آمادہ کریں۔ دوسرے وہاں کی رنڈیوں کو اس قدر اقتدار حاصل نہیں ہے اس لیے وہ رؤسا اور زمینداروں کی مطیع فرمان ہوتی ہیں اور بہت ڈرتی ہیں کہ انکا آذوقہ بلکہ زندگی ان کے دستِ قدرت میں ہے اس لیے ان کی اولاد سے بہت چوری چھپے ملتی ہیں۔ اور شہروں میں تو آزادی ہے کون کس کا دباؤ مانتا ہے اسی کا یہ نتیجہ ہے۔

امراو: ۔مگر دیہاتی جب بگڑتے ہیں تو حد سے زیادہ بگڑ جاتے ہیں مثلاً میاں راشد علی کا واقعہ آپ سن چکے ہیں۔

رسوا: ۔اس کا یہ سبب ہے کہ وہ ان لذتوں سے بالکل نابلد ہوتے ہیں، جب ان کو اس کا چسکا پڑتا ہے تو وہ اس کی حد سے زیادہ قدر کرتے ہیں۔ اور اہلِ شہر کچھ نہ کچھ آگاہ ہوتے ہیں اور اس لیے ان کو زیادہ شغف اور انہماک نہیں ہوتا۔

رسوا: ۔ہاں وہ آپ کی نوچی کیا ہوئی اے ہے بھلا سا نام ہے۔

امراو: ۔آبادی۔

رسوا: ۔آبادی کی صورت تو اچھی تھی، میں نے اس وقت دیکھا تھا جب اس کا سن بارہ برس کا تھا جوانی میں تو اور نکھر گئی ہو گی؟

امراو: ۔مرزا صاحب آپ کو خوب یاد ہے۔

رسوا:۔ یاد کو کیا چاہیے۔ واقع میں بہت قطع دار عورت ہوگی۔ ہم بھی اسی نظر سے دیکھتے تھے کہ کبھی تو جوان ہوگی۔

امراو: تو یہ کہیے آپ بھی بی آبادی کے امیدواروں میں تھے؟

رسوا:۔ سنو! امراؤ جان میری ایک بات یاد رکھنا۔ جہاں کوئی حسین عورت نظر پڑے مجھے ضرور یاد کر لینا، اگر ممکن ہو تو امیدواروں میں نام لکھوا دینا اور جو میں مر جاؤں (خدانخواستہ) تو میرے نام پر فاتحہ دے دینا۔

امراو:۔ اور اگر کوئی مرد حسین نظر آئے؟

رسوا:۔ اپنا نام امیدواروں میں اور میرا نام اس کی بہن کے امیدواروں میں لکھوا دینا بشرطیکہ شرعاً ممنوع نہ ہو۔

امراو:۔ کیا خوب! شرع کو کہاں دخل دیا ہے۔

رسوا:۔ شرع کا دخل کہاں نہیں ہے۔ خصوصاً ہماری شرع جس میں کوئی فروگذاشت نہیں کی گئی ہے۔

امراو:۔ سیدھی سی ایک بات کیوں نہیں کہہ دیتے۔ ع

شرعاً تو جانتے ہیں پہ عرفاً درست ہے

رسوا:۔ یہ اور موقعوں پر کہا جاتا ہے۔ امراو جان میری زندگی کا ایک حصول ہے، نیک بخت عورت کو میں اپنی ماں بہن کے برابر سمجھتا ہوں خواہ وہ کسی قوم وملت کی کیوں نہ ہو۔ اور ایسی حرکتوں سے مجھے سخت صدمہ پہنچتا ہے جو اس کی پارسائی میں خلل انداز ہوں اور وہ رغلانے یا بدکار بنانے کی کوشش کرتے ہیں میری رائے میں قابل گولی مار دینے کے ہیں مگر فیاض عورتوں کے فیض سے مستفید ہونا میرے نزدیک کوئی گناہ نہیں۔

امراو:۔ سبحان اللہ!

رسوا:۔ خیر اب اس فضول بات کو رہنے دیجیے۔ آبادی جان کا حال کہیے۔

امراو: ۔مرزا صاحب! اگر آپ اس کو جوانی کے عالم میں دیکھتے تو یہ شعر ضرور آپ کی زبان پر ہوتا ہے

جواں ہوتے ہی وہ تو اور ہی کچھ ہو گئے اے دل

کہاں کی پاکبازی ہم بھی اب نیت بدلتے ہیں

جوان ہو کے اس نے وہ صورت شکل نکالی تھی کہ سو پچاس رنڈیوں میں ایک تھی۔

رسوا: ۔اب کیا ہوئی خدا کے لیے جلدی کہیے۔ کس شہر چلی گئی۔ آخر آفت کیا ہوئی جو آپ ایسی مایوسی کے کلمات کہتی ہیں۔

امراو: ۔ہم سے گئی جہان سے گئی۔

رسوا: ۔آخر ہے اب کہاں؟

امراو: ۔اسپتال میں ہے اور کہاں ہے۔

رسوا: ۔یہ کہیے گلِ جوانی شگفت۔

امراو: ۔جی ماشاءاللہ سے خوب پھولیں پھلیں۔ صورت بگڑ گئی رنگت الٹا توا ہو گئی۔ غرضیکہ ستر کرم ہو گئے اب جان کے لالے پڑے ہیں۔

رسوا: ۔یہ ہوا کیا تھا؟

امراو: ۔اے ہوا کیا تھا، موئی لونڈے گھیری، سفلی، چھچھوری، میں نے بہت چاہا کہ آدمی بنے مگر نہ بنی۔ میں نے کیا نہیں کیا۔ استاد جی کو نوکر رکھا، تعلیم دینا شروع کیا مگر اس کا دیدہ ایسی باتوں میں کب لگتا تھا۔ جب سے جوان ہوئی میں نے کمرہ علیحدہ کر دیا تھا۔ شہر کے چند ذات شریف آ کے بیٹھنے لگے، دن گالم گلوچ، دھینگا مشتی، جوتم پیزار میں جاتا، ایک آفت برپا رہتی تھی۔ ناک میں دم ہو گیا تھا۔ کسی پر بند نہیں جو آیا وارد۔ میں نے مارا پیٹا، سمجھایا مگر وہ کب سنتی تھی۔ بچپنے ہی سے اس کی نگاہ بد تھی۔ اُس زمانے میں بوا حسینی کا نواسہ جمن آیا کرتا تھا۔ اس سے کھیلا کرتی۔

میں نے یہ خیال کیا بچہ ہیں۔ کھیلنے دو۔ آخر کچھ ایسی باتیں آنکھ سے دیکھیں کہ جمن کی آمدروفت موقوف ہوئی۔ ایک صاحب میرے پاس تشریف لایا کرتے تھے ذرا خوش گلو تھے۔ میں گوایا کرتی تھی، ان سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ وہ شریف خاندان تو تھے مگر طبیعت پاجی تھی۔ نہ میرا لحاظ کیا نہ اپنی حیثیت دیکھی۔ ایک دن سرِ شام کیا دیکھتی ہوں، ڈیوڑھی میں آبادی سے باتیں ہو رہی ہیں:۔

چھٹن صاحب:۔ اری میں تو تیری صورت کا عاشق ہوں۔ ہائے آبادی کیا کروں، امراو جان سے ڈرتا ہوں۔

آبادی:۔ ہٹو! ایسی باتیں مجھ سے نہ کیا کرو۔ ڈر کاہے کا؟

چھٹن نے آبادی کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔

چھٹن صاحب:۔ ظالم کیا پیاری پیاری صورت ہے۔

آبادی:۔ پھر تمہیں کیا؟

چھٹن صاحب:۔ (ایک بوسہ لے کے) ہمیں کیا مرتے ہیں جان جاتی ہے۔

آبادی:۔ موے چار آنے تو دیے نہیں جاتے، مرتے ہیں۔ میاں مرتے سب کو دیکھا جنازہ کسی کا بھی نکلتے نہیں دیکھا۔

چھٹن:۔ چار آنے! آنے! جان حاضر ہے۔

آبادی:۔ نگوڑی جان کو میں لے کے کیا کروں گی؟

چھٹن:۔ لو ہماری جان کسی کام کی نہیں؟

آبادی:۔ لے بابا باتیں نہ بناد۔ چونی جیب میں پڑی ہے ہو تو دیتے جاؤ۔

چھٹن:۔ واللہ! اماں کی تنخواہ نہیں بٹی، پرسوں ضرور ضرور لیتا آؤں گا۔

آبادی:۔ اچھا تو اب جان چھوڑ دو۔

چھٹن:۔ اچھا تو ایک بوسہ تو اور دے دو۔

آبادی کو چھٹن نے گلے لگایا۔ آبادی نے ان کی جیب میں ہاتھ ڈالا، کہیں

اتفاق سے تین پیسے پڑے ہوئے تھے، نکال لیے۔

چھٹن: ۔تمھیں ہمارے سر کی قسم یہ پیسے نہ لینا، باجی نے رنگ کی پڑیاں اور مسی منگائی ہے۔

آبادی: ۔تمہارے سر کی قسم، میں تو نہ دوں گی۔

چھٹن: ۔آخر کیا کروں گی پرسوں چونی لے لینا۔

آبادی: ۔وہ! خاگینہ[1] لیں گے۔

چھٹن: ۔تین پیسے کا خاگینہ! اچھا پیسہ لے لو۔

آبادی: ۔تین پیسے کا خاگینہ کچھ بہت ہوا؟ نگوڑا بہت دن سے جی چاہتا ہے، بیوی لینے نہیں دیتیں، کہتی ہیں پیٹ میں درد ہو گا۔ میں تو ایک دن چھپا کے ایک آنے کا خاگینہ کھا گئی، کچھ بھی نہیں ہوا۔

میں نے دل میں کہا کیوں نہ ہو موئی کال[2] کی ماری، بلا نوش۔ ہم تو ذرا سا بھی کھالیں تو بدہضمی ہو جائے۔

رسوا: ۔کیا اسے کال میں لیا تھا؟

امراؤ: ۔جی ہاں! ایک روپیہ کو ماں بیچ گئی تھی۔ تین دن کے فاقہ سے تھی۔ میں نے روٹی کھلائی اور ایک روپیہ دیا۔ مرزا صاحب مجھے بڑا ترس معلوم ہوا۔ میں نے تو کہا تھا میرے پاس رہ مگر نہ رہی۔

رسوا: ۔کم بخت کبھی پھر بھی آئی تھی؟

امراؤ: ۔جی کئی دفعہ۔ لڑکی کو دیکھ کے بہت خوش ہوئی۔ مجھ کو دعائیں دیتی تھی۔ سال میں دو ایک مرتبہ آ جایا کرتی تھی۔ مجھ سے بھی جو کچھ ہو سکتا تھا، سلوک کرتی تھی۔ اب کئی برس سے نہیں آئی خدا جانے مر گئی یا جیتی ہے۔

رسوا: ۔ذات کیا تھی؟

امراو: ۔پاسن۔

رسوا: ۔اچھاتو وہ قصہ تو رہ گیا، چھٹن نے چونی دی یا نہیں دی۔

امراو: ۔میری جانے بلا۔چھٹن کے جانے کے بعد میں نے موئی کو خوب کچلا۔پیسے چھین کے چوک میں اچھال دیے۔

میرے کمرے کے برابر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا کوئی دو روپے مہینہ کرایے کا اُس میں ایک رنڈی آ کے رہتی تھی حسنا۔ابھی جوان تھی۔اس کی اور آبادی کی پرگت خوب ملی، دن بھر وہیں بیٹھی رہی کرتی تھی۔ساری خصلتیں حسنا کی اس نے اختیار کرلیں۔

جیسی وہ رنڈی تھی، ویسے ہی اس کیا آشنا۔ایک آیا پاو بھر پوریاں تیل کی لیے چلا آتا ہے۔دوسرا اپچاس آم دو آنے سیکڑہ کے لیتا آیا۔کسی سے دو گز نینون کی فرمایش ہے۔کسی سے مخملی بوٹ کا چونگا ہے۔میلے تماشے میں دو چار گرگے ساتھ ہیں۔بڑے بڑے صافے بندھے ہوئے کف دار کرتے یا انگرکھے پہنے ہوئے، کوئی دھوتی باندھے ہے کوئی چست گھٹنہ ڈانٹے ہے۔ہاتھ میں لٹھ ہے، گلے میں ہار پڑے ہوئے، بی حسنا ٹھمک ٹھمک ان کے ساتھ چل رہی ہیں۔ہرن والی سرا میں ایک بوتل ٹھرے کی اڑی۔وہاں سے چلے تو جھومتے جھامتے لڑکھڑاتے گاتے ناچتے۔بی حسنا بائی اس کی بغل میں تھیں ابھی اس کے گلے میں ہاتھ، سرِ راہ گالم گلوچ، نوچم کھسوٹ، جوتم جاتا ہو رہا ہے۔اس حالت میں دو ایک تو رستے ہی میں گر پڑے ہیں ،تین چار میلے تک پہونچے۔وہاں چرس پر دم پڑے۔ان میں سے جو کوئی ہوشیار رہا اس نے بی حسنا کو گانٹھ لیا اور یاروں کو دھتا بتائی۔اپنے گھر لے گیا یا انھیں کے کمرے پر آ کے ٹھہرا اور یار جب میلے سے پلٹ کے آئے کمرے کے نیچے کھڑے چیخ رہے ہیں اور گالیاں دے رہے ہیں اور ڈھیلے مار رہے ہیں۔بی حسنا اول تو کمرے میں

ہیں نہیں اور ہیں بھی تو بولیں کیوں ۔ اتنے میں کوئی برقنداز[1] چلا آیا۔ اس نے مجمع خلاف قانون کو برہم کیا۔ سب اپنے اپنے گھر کو چلے گئے۔

بس یہی انداز آبادی بھی چاہتی تھی ۔ بھلا میں اسکی کب روادار ہوتی؟ آخر حسین علی (میرے پاس ایک نواب صاحب آیا کرتے تھے ان کے خدمت گار کا نام تھا) کے ساتھ نکل گئی ۔ اس کے گھر جا کے بیٹھ رہی ۔ وہاں اس کی جورو نے قیامت برپا کی ۔ گھر سے نکل گئی ۔ میاں حسین علی اُن پر لٹو تھے ۔ بیوی کے نکل جانے کی انھیں کوئی پرواہ نہ ہوئی مگر مشکل یہ درپیش ہوئی کہ اب کھانا کون پکاوے؟ بی آبادی کو چولھا پھونکنا پڑا ۔ یہ اس کی کب عادی تھیں ۔ بہر طور چند روز یوں گذرے ۔ یہیں ایک بچہ جنیں ۔ خدا جانے حسین علی کا تھا یا کسی اور کا۔ دو مہینہ کا ہو کے وہ بچہ جاتا رہا۔ ادھر حسین علی کی جورو نے روٹی کپڑے کا دعویٰ کیا۔ ڈیڑھ روپیہ مہینہ کی ڈگری ہوئی ۔ تین روپیہ نواب دیتے تھے ڈیڑھ روپیہ میں کیا ہوتا؟ اوپر کی آمدنی پر بسر تھی اس میں بھی کچھ نہ چلی ۔ بی آبادی کسی قدر چٹوری بھی تھیں ۔ آخر میاں حسین علی کے گھر میں سے نکل کے محلے کے ایک لڑکے کیساتھ بھاگیں ۔ اس کی ماں پٹھانی کٹنی بڑے مشہوروں میں تھی جہاں دو چار رلقندریاں[1] اور رہتی تھیں وہیں ان کا بھی ٹھکانا ہوگیا ۔ بی پٹھانی کی روزی میں کسی قدر اور وسعت ہوئی ۔ منے برائے نام رہ گئے ۔ میاں منے کے ایک پیر بھائی سعادت پٹھانی کو جل دے کے لے اڑے ۔ یہ اپنی ماں کے پاس لے گئے ۔ ان کی والدہ کو مرغیوں سے شوق تھا۔ مکان کے پاس ایک تکیہ تھا وہاں مرغیاں چرا کرتی تھیں ۔ بی آبادی اُن کی حفاظت پر متعین ہوئیں ۔ میاں سعادت کسی کارخانے میں کام کرتے تھے ۔ دن بھر وہاں چلے جاتے تھے ۔ یہ مرغیاں ہنکایا کرتی تھیں ۔ وہاں انھوں نے محمد بخش کلو کنجڑن کے لڑکے سے راہ و رسم پیدا کی ، بلکہ سعادت کی ماں نے یہ معاملہ دیکھ بھی لیا ، بیٹے سے کہا۔ اس نے خوب جوتے مارے ۔ میاں محمد بخش کے ایک اور یار تھے میاں امیر ۔ نواب امیر مرزا کے

خدمت گاروں میں نوکر تھے، یہ فن تماش بینی میں طاق تھے وہ اڑا لے گئے انھوں نے ایک مکان میں لے جا کر رکھا، یہاں اوریاروں کا مجمع بھی رہتا تھا۔بی آبادی سب کی دلجوئی میں مصروف رہتی تھیں۔ اس زمانے میں نہیں معلوم کس کی برکت سے خوب پھلیں پھولیں اب میاں امیر کے کس کام کی تھیں، اس نے اٹھا کے اسپتال میں پھنکوادیا۔بالفعل وہیں تشریف رکھتی ہیں۔اگر آپ فرمایئے تو بلوادی جائیں۔

رسوا:۔ مجھے تو معاف ہی کیجیے۔

ہاتھ آئی مراد منہ مانگی

دل نے پائی مراد منہ مانگی

رجب کی نوچندی تھی۔ کچھ بیٹھے بیٹھے میرے دل میں آئی چلو درگاہ چلیں زیارت ہی کریں۔سرِ شام سوار ہو کے پہنچیں بڑا مجمع تھا پہلے تو میں مردانی درگاہ کے صحن میں اِدھر اُدھر ٹہلا کی پھر جا کے شمعیں جلائیں چڑھائی۔ایک صاحب مرثیہ پڑھ رہے تھے انھیں سنا پھر ایک مولوی صاحب آئے، انھوں نے حدیث پڑھی اس کے بعد ماتم ہوا۔اب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلنے لگے۔ میں نے بھی زیارت رخصتی پڑھ کے واپسی کا ارادہ کیا۔دروازے تک پہنچ کے جی میں آیا زنانی درگاہ میں ہوتی چلوں۔نوحہ خوانی کی شہرت اور نواب ملکہ کشور کی سرکار سے توسل کی وجہ سے اکثر عورتیں مجھ کو جانتی تھیں۔میں نے خیال کیا کہ دو چار مل ہی جائیں گی اسی بہانے سے ملاقاتیں ہو جائیں گی۔سوار ہو کے چو پہلے پر پردہ ڈال کے زنانی درگاہ کے دروازے پر پہنچی۔محلدار نے آ کے سواری اتروائی۔ اندر گئی، میرا خیال غلط نہ تھا۔ اکثر عورتوں سے سامنا ہوا۔شکوے، شکایتیں، غدر کے حالات اور ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں۔بڑی دیر ہوگئی۔ میں واپس آنے ہی کو تھی کہ اتنے میں دیکھتی کیا ہوں دہنی طرف کی صحنچی سے کانپور والی بیگم صاحب نکلی چلی آتی ہیں۔ بڑے ٹھاٹھ ہیں تو لواں

جوڑا پہنے ہوئے، چار پانچ مہریاں ساتھ ہیں۔ ایک پانچے سنبھالے ہوئے ہے، ایک کے ہاتھ میں پنکھا ہے، ایک لوٹیا خاصدان لیے ہے، ایک کے پاس سینی میں تبرکات ہیں۔ مجھے دور سے دیکھتے ہی دوڑیں۔ کندھے پر ہاتھ رکھ دیے۔

بیگم:۔ اللہ امراو! تم تو بڑی بے مروت ہو۔ کانپور سے جو غائب ہوئیں تو آج ملی ہو وہ بھی اتفاق سے۔

میں:۔ کیا کہوں، جس دن آپ کے باغ میں رات کو رہی تھی، اسی دن صبح کو لکھنؤ سے لوگ آ کے مجھے پکڑ کے لکھنؤ لے گئے پھر بھاگ کر لٹھوئی۔ خدا جانے کہاں کہاں ماری پھری۔ نہ مجھے آپ کا پتہ تھا نہ آپ کو میرا حال معلوم تھا۔

بیگم:۔ خیر! اب تو ہم تم دونوں لکھنؤ میں ہیں۔

میں:۔ لکھنؤ کیسا؟ اس وقت تو ایک ہی مقام پر ہیں۔

بیگم:۔ اس کی سند نہیں۔ تمہیں تو میرے مکان پر آنا ہوگا۔

میں:۔ سر آنکھوں سے۔ مگر آپ رہتی کہاں ہیں؟

بیگم:۔ چوپٹیوں پر۔ نواب صاحب کو کون نہیں جانتا؟

میں پوچھنے ہی کو تھی کہ کون نواب صاحب۔ اتنے میں ایک مہری بول اٹھی۔ نواب محمد تقی خاں کا مکان کون نہیں جانتا؟

میں:۔ آنے کو تو آؤں مگر نواب صاحب کے خلاف نہ ہو۔

بیگم:۔ نہیں وہ اس طبیعت کے آدمی نہیں ہیں اور پھر تمہارے واسطے۔ میں نے اس رات کا حال رتی رتی ان سے کہا تھا۔ انھوں نے تو خود کانپور میں کئی مرتبہ ڈھونڈوایا، اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔

میں:۔ اچھا تو ضرور آؤں گی۔

بیگم:۔ کب آؤ گی، وعدہ کرو؟

میں:۔ اب کی جمعرات کو حاضر ہوں گی۔

بیگم :۔ اوہی! یہ جمعرات کی ارواح تم کب سے ہوگئیں؟ ابھی تو پورے آٹھ دن ہیں ۔ادھر ہی کیوں نہیں آتیں؟

میں :۔ اچھا تو اگلی پیر کو آؤں گی ۔

بیگم :۔ اتوار کو آؤ، نواب بھی گھر میں ہوں گے پیر کے دن کسی انگریز سے ملنے والے ہیں ۔

میں :۔ مناسب ہے اتوار کو ہی ۔

بیگم :۔ کس وقت آؤ گی ۔

میں :۔ جس وقت کہیے، مجھے گھر پر کوئی کام نہیں ۔ ہر وقت برابر ہے ۔

بیگم :۔ تم کہاں رہتی ہو؟

میں :۔ چوک میں سید حسن خاں کے پھاٹک کے پاس ۔

بیگم :۔ اچھا تو مہری کو بھیج دوں گی، اسی کے ساتھ چلی آنا ۔

میں :۔ بہت اچھا۔

بیگم :۔ اچھا تو خدا حافظ!

میں :۔ خدا حافظ، ہاں تو کہیے صاحب زادہ کیسا ہے،

بیگم :۔ ہوں ، ماشاءاللہ اچھا ہے لو اب تم نے یاد کیا؟

میں :۔ کیا کہوں باتوں میں کیسی بھولی اور بھولی کیا، جب چاہتی تھی پوچھوں ایک نہ ایک بات نکل آتی تھی ۔

بیگم :۔ اب تو سلامتی سے ذرا ہوش سنبھالا ہے ۔ اچھا اس دن اسے بھی دیکھ لینا ۔

میں :۔ رات کی نیت حرام، لے اب کچھ نہ کہیے خدا حافظ ۔

بیگم :۔ خدا حافظ، دیکھو ضرور آنا ۔

میں :۔ ایسی بات ہے ۔

اتنے میں مہری نے دیکھا کہ باتوں کا پھر سلسلہ چلا کہنے لگی ، بیگم صاحب چلیے

دیر سے کہار غل مچا رہے ہیں۔سواری لگی ہے۔

ہر چند بہت غور کیا ہم نے شب و روز
دنیا کا طلسمات سمجھ میں نہیں آتا

میں خانم سے علیحدہ ہوگئی تھی مگر جب تک وہ جیتی رہیں اپنا سر پرست سمجھا کی اور سچ یہ ہے کہ انھیں بھی بہت مجھ سے محبت تھی۔ان کے پاس اس قدر دولت تھی کہ طبیعت غنی ہوگئی تھی۔سن جو زیادہ ہوگیا تھا تو دنیا کی طرف سے ان کی طبیعت پھر گئی تھی۔اب ان کو کسی کی کمائی سے کچھ مطلب نہ تھا مگر محبت اسی طرح کرتی تھیں۔وہ اپنے جیتے جی کسی نوچی کو اپنے سے جدا نہ کرتی تھیں۔مجھ سے تو ان کو خاص محبت تھی۔بسم اللہ نے ان کو بہت آزار دیے اس لیے انھیں نفرت سی اس سے ہوگئی تھی لیکن پھر اولاد تھی۔خورشید جان بھی غدر کے بعد آگئی تھیں،وہ خانم کے پاس رہتی تھیں۔امیر جان نے علیحدہ کمرہ لے لیا تھا مگر وہ بھی آتی جاتی رہتی تھیں۔

جو کمرہ خانم نے مجھے دیا تھا وہ ان کی زندگی بھر مجھ سے خالی نہیں کرایا گیا۔میرا اسباب اس میں بند رہتا تھا۔میرا قفل لگا تھا جب جی چاہتا تھا وہیں جا کے رہتی تھی۔ سال بھر کہیں رہوں مگر محرم میں تعزیہ داری وہیں کرتی تھی۔میرے نام کا تعزیہ خانم مرتے دم تک رکھا کیں۔

جمعرات کو بیگم سے ملاقات ہوئی تھی جمعہ کو آدمی آیا کہ خانم صاحب کی طبیعت کچھ علیل ہے تمھیں یاد کرتی ہیں۔میں فوراً سوار ہوکے گئی۔انھیں دیکھ کر گھر واپس آنے کا ارادہ کیا کہ جی میں آیا کہ ایک بھاری جوڑہ نکال لیتی چلوں۔کمرہ کھولا دیکھا کمرے میں چاروں طرف جالے لگے ہیں،پلنگ پر منوں گرد پڑی ہے،فرش فروش الٹا پڑا ہے،ادھر ادھر کوڑا پڑا ہے۔یہ حال دیکھ کے مجھے اپنے اگلے دن یاد آئے۔اللہ

ایک وہ دن تھا کہ یہ کمرہ ہر وقت کیسا سجا سجایا رہتا تھا، دن بھر میں چار مرتبہ جھاڑو ہوتی تھی، بچھونے جھاڑے جاتے تھے گرد کا نام نہ تھا، تنکا تک کہیں پڑا نہ رہتا تھا یا اب یہ حال ہے کہ دم بھر بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہی پلنگ جس پر میں سوتی تھی اب اس پر قدم رکھتے ہوئے کراہت معلوم ہوتی تھی۔ آدمی ساتھ تھا میں نے اس سے کہا ذرا جالے تو لے لے۔ وہ ایک سینٹھا[1] کہیں سے ڈھونڈھ کے اٹھا لایا۔ جالے لینے

لگا۔ اتنی دیر میں میں نے اپنے ہاتھ سے دری الٹی۔ آدمی نے اور میں نے مل کے دری بچھائی، چاندنی کو ٹھیک کیا۔ جب فرش درست ہو گیا تو میں نے پلنگ کے بچھونے اٹھوا کے جھڑوا دیے۔ کوٹھری میں سنگاردان، پاندان، اگالدان اٹھا لائی سب چیزیں اپنے اپنے قرینے سے لگا دیں جس طرح کسی زمانہ میں لگی رہتی تھیں۔ خود پلنگ سے تکیہ لگا کے بیٹھی۔ آدمی کے پاس خاصدان تھا پان لے کے کھایا۔ آئینہ سامنے لگا کے منہ دیکھنے لگی۔ اگلا زمانہ یاد آ گیا۔ شباب کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ اس زمانہ کے قدر دانوں کا تصور بندھ گیا۔ گوہر مرزا کی شرارت، راشد علی کی حماقت، فیضو کی محبت، سلطان کی صورت غرضیکہ جو جو صاحب اس کمرے میں آئے تھے مع اپنی اپنی خصوصیات کے میرے پیش نظر تھے۔ وہ کمرہ اس وقت فانوسِ خیال بن گیا تھا۔ ایک تصویر آنکھ کے سامنے آتی تھی اور غائب ہو جاتی تھی پھر دوسری سامنے آتی تھی۔ جب کل صورتیں گذر گئیں تو یہ دورہ از سرِ نو پھر شروع ہوا۔ پھر وہیں صورتیں ایک دوسرے کے بعد پیش آئیں پہلے تو ایسے دورے جلد جلد ہوئے اب ذرا توقف ہونے لگا۔ اب مجھ کو ہر تصویر پر زیادہ تر دفکر کرنے کا موقعہ ملا۔ جو واقعات جس شخص کے متعلق تھے ان پر تفصیلی نظر پڑنے لگی۔ پہلے جب دماغ کو چکر ہوا تھا تو صرف چند ہی تصویریں نظر آتی تھیں، اب ہر تصویر سے بہت سی نکلیں اور فانوسِ خیال کی وسعت بڑھنے لگی۔ تمام زندگی میں جو کچھ لگا، سب نگاہ کے سامنے تھا۔ اس اثناء میں ایک مرتبہ سلطان صاحب کو دیکھا اور دوسرے دن ان کے خدمت گار کا آنا پھر ان کا خود

تشریف لانا، مزے کی باتیں، شعروسخن کا چرچا، خاں صاحب کا گر پڑنا، شمشیر خاں کی جان نثاری، کوتوال کا آنا جانا خاں صاحب کا گھر بھجوانا اور سلطان صاحب کا نہ آنا محفل میں ان کو دیکھنا، لڑکے کے ہاتھ رقعہ بھیجنا، پھر از سر نو رسم ہونا، نواز گنج کے جلسے، یہ سب واقعات اس طرح سے معلوم ہوتے تھے جیسے کل ہوئے ہیں۔ یہ دورے برابر چل رہے تھے مگر جب پہلے مجرے کے بعد سلطان کے آدمی کا پیام لے کے آنا یاد آتا تھا، طبیعت کچھ رک سی جاتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس موقعہ پر کچھ چھوٹ جاتا ہے، اتنے میں آدمی نے زور سے ایک چیخ ماری۔

آدمی:۔بیوی دیکھیے وہ کھنکھجورا آپ کے دوپٹہ پر چڑھ جاتا ہے۔

میں:۔اوہی کہہ کے اٹھ جلدی سے دوپٹہ اتار کے پھینک دیا۔ الگ جا کھڑی ہوئی۔ آدمی نے دوپٹہ اتار کے جھاڑا۔ کھنکھجورا پٹ سے گرا اور رینگ کے پلنگ کے سرہانے پائے کے نیچے گھس گیا۔ آدمی نے پلنگ کا پایا اٹھایا اب جو دیکھتے ہیں تو پائے کے نیچے پانچ اشرفیاں برابر بچھی ہوئی ہیں۔

آدمی:۔(بہت ہی متعجب ہو کے) ہائیں اے لیجیے یہ کیا ہے؟

میں:۔(دل میں) اہاہ! یہ وہ اشرفیاں ہیں (آدمی سے) اشرفیاں ہیں۔

آدمی:۔واہ! اشرفیاں یہاں کہاں سے آئیں؟

میں:۔(ہنس کے) وہ کھنکھجورا اشرفیاں بن گیا۔ اچھا اٹھا لو۔

آدمی:۔پہلے تو ذرا جھجکا پھر پانچوں اشرفیاں مجھے اٹھا کے حوالے کیں۔

رسوا:۔تو کیا خانم کا مکان غدر میں نہیں لٹا۔؟

امراؤ:۔لٹا کیوں نہیں مگر فرض کر لیجیے کے کسی نے میرے پلنگ کا پایا اٹھا کے نہیں دیکھا۔

رسوا:۔ممکن ہے۔

کسی طرح سے ہو تسکینِ شوق، کیسا رشک
ملیں گے آج ہم ان سے، رقیب سے مل کے

اتوار کے دن ۸ بجے صبح کو بیگم صاحب کی مہری فینس اور کہار لے کے سر پر نازل ہوگئیں۔ میں ابھی سو کے اٹھی تھی۔ اچھی طرح حقہ بھی نہ پینے پائی تھی کہ اس نے جلدی مچانا شروع کر دی۔ میں سمجھی تھی کھانا وانا کھا کے جانا ہوگا۔ مہری نے کہا بیگم صاحبہ نے اپنے سر کی قسم دی ہے کہ کھانا یہیں آ کے کھانا۔ میں نے پوچھا نواب صاحب گھر پر ہیں۔ اس نے کہا نہیں صبح سے اٹھ کے گاؤں کو سدھارے ہیں۔ میں نے پوچھا کب تک آئیں گے؟ مہری نے کہا اب آئیں تو شام آئیں۔ مجھے بیگم سے بہت سی باتیں کرنا تھیں اس لیے فوراً اٹھ بیٹھی۔ ہاتھ منہ دھو کے کنگھی چوٹی کر، کپڑے پہن، ایک ماما کو ساتھ لے کے روانہ ہوگئی۔

جا کے جو دیکھا بیگم صاحب منتظر ہیں۔ میرے جانے کے ساتھ ہی دستر خوان بچھا۔ میں نے اور بیگم صاحبہ نے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھایا۔ بہت تکلف کا کھانا تھا۔ پراٹھے، قورمہ، کئی طرح کا سالن، بالائی، مہین چاولوں کا خشکہ، نورتن چٹنی، سیب کا مربہ، حلوا سوہن،

کھانا کھاتے ہوئے چپکے سے میرے کان میں۔

بیگم:۔ کیوں وہ کریم کے گھر کی ارہر کی دال اور جوار کی روٹیاں بھی یاد ہیں؟

میں:۔ چپ بھی رہو، کوئی سن نہ لے۔

بیگم:۔ سن لے گا تو کیا ہوگا؟ کیا کوئی جانتا نہیں۔ نواب کی ماں (خدا جنت نصیب

کرے) نے مجھے نواب کے لیے مول لیا تھا۔

میں:۔ برائے خدا چپ رہو کہیں علیحدہ چلو تو باتیں ہوں گی۔

کھانا کھا کے ہاتھ منہ دھویا، پان کھایا، مہری نے حقہ لا کے لگایا، بیگم نے سب کو بہانے سے ٹال دیا۔

میں:۔ بارے تم نے مجھے پہچان لیا۔

بیگم:۔ جب تمہیں پہلے کانپور میں دیکھا تھا اسی دن پہچان لیا تھا۔ پہلے تو بڑی دیر تک الجھن سی ہی تھی، دل میں کہتی تھی میں نے انھیں کہیں دیکھا ہے مگر کہاں دیکھا ہے، یہ کچھ یا نہیں آتا تھا۔ چاروں طرف خیال دوڑاتی تھی۔ کچھ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا۔ اتنے میں کریمن مہری پر نظر پڑی۔ کریمن کے نام پر مونڈی کاٹے کریم کا نام یاد آ گیا۔ دل نے کہا اوہو! انھیں کریم کے مکان پر دیکھا تھا۔

میں:۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ بڑی دیر تک غور کیا کی۔ مری ساتھ والیوں میں ایک خورشید ہے، اس کی صورت تم سے بہت ملتی ہے جب میں خورشید کو دیکھتی تھی تم یاد آ جاتی تھیں۔

بیگم:۔ اب میرا حال سنو!

میں جب تم سے جدا ہو کے نواب صاحب کی ماں نواب عمدۃ النساء بیگم صاحبہ کے ہاتھ بکی ہوں۔ تمہیں یاد ہوگا میرا سن کوئی بارہ برس کا ہوگا۔ نواب کا سولھواں برس تھا۔ نواب کے ابا جان کانپور میں رہتے تھے۔ بیگم صاحب کی ان سے نا اتفاقی رہتی تھی۔ نواب صاحب کے ابا جان نے نواب کی شادی اپنی بہن کی لڑکی کے ساتھ ٹھہرائی تھی ان کا مکان دہلی میں تھا۔ بیگم صاحب کو وہاں شادی کرنا منظور نہ تھا۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ نواب کی شادی ان کے بھائی کی لڑکی سے ہو۔ ابھی یہ جھگڑا طے نہ ہوا تھا کہ نواب کے دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ حکیموں نے تجویز کیا کہ بہت جلد شادی کر دینا چاہیے ورنہ جنون ہو جائے گا۔ شادی ہو جانا کسی طرح ممکن نہ تھا! اتنے

میں میں پہونچ گئی۔ بیگم صاحب نے مجھے خرید لیا۔

نواب صاحب مجھ پر مائل ہو گئے اور ایسے مائل ہوئے کہ دونوں جگہ کی شادی سے کھلم کھلا انکار کر دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ بیگم صاحب نے انتقال کیا اور اس کے چند ہی سال بعد بڑے نواب بھی مر گئے۔ ماں باپ دونوں صاحبِ جائداد تھے۔ یہی ایک اکلوتے لڑکے تھے۔ کل دولت انھیں کو ملی۔

خدا نواب صاحب کو سلامت رکھے جنکی بدولت بیگم صاحب بنی ہوئی ہوں اور چین کرتی ہوں، نواب مجھے اسی طرح چاہتے ہیں جیسے کوئی اپنے سہرے جلوے کی بیوی کو چاہتا ہو۔ میری ظاہر میں تو کسی طرف نگاہ اٹھا کے بھی نہیں دیکھا یوں اپنے باہر دوست آشناؤں میں جو کچھ چاہتے ہوں کرتے ہوں آخر مرد ذات ہیں کچھ میں ان کے پیچھے تو پھرتی نہیں۔

خدا نے سب آرزو میری پوری کیں۔ اولاد کی ہوس تھی۔ خدا کے صدقے سے اولاد بھی ہے۔ اب اگر آرزو ہے تو یہ ہے کہ خدا انھن کو پروان چڑھائے بہو بیاہ کے لاؤں اور ایک پوتا کھلاؤں پھر چاہے مرجاوں۔ نواب کہ ہاتھوں مٹی عزیز ہو جائے اب تم حال کہو۔

جب رام دئی یہ باتیں کر رہی تھی مجھے اپنے قسمت پر افسوس آتا تھا اور دل ہی دل میں کہتی تھی تقدیر ہو تو ایسی ہو۔ ایک میری پھوٹی تقدیر کی بھی تو کہاں رنڈی کے گھر میں۔

اس کے بعد میں نے اپنا مختصر حال کہہ سنایا کہ جس سے آپ بخوبی واقف ہیں، میں دن بھر وہیں رہی۔ جب تخلیہ کی باتیں ہو چکیں تو نوکروں کو آواز دی۔ طبلے کی جوڑی، ستار، طنبورہ یہ سب سامان منگایا، گانے بجانے کا جلسہ ہوا۔

جب ہم دونوں اکیلے تھے تو وہ رام دئی تھیں اور میں امیرن۔ سب لوگوں کے سامنے پھر وہ بیگم صاحب ہو گئیں اور میں امراؤ جان۔ تین چار گھنٹے تک گانا بجانا

ہوتا رہا۔ بیگم بھی کسی قدر ستار بجا لیتی تھیں۔ جب میں گا چکتی تھی تو وہ ستار کی کوئی گت چھیڑ دیتی تھیں۔ ایک مغلانی کا گلا بہت اچھا تھا اس کو گوایا۔ سرِ شام تک بڑے لطف کی صحبت رہی۔

ہاں اے نگاہِ شوق مناسب ہے احتیاط
ایسا نہ ہو کہ بزم میں چرچا کرے کوئی

قریب شام محل میں نواب صاحب کی آمد آمد کا غل ہوا۔ وہ بے تکلفی کی صحبت برہم ہوگئی۔ طبلے کی جوڑی، طنبورہ سب چیزیں ہٹا دی گئیں۔ چھپنے والیاں اٹھ اٹھ کے پردے میں جانے لگیں اور سب لوگ اپنے اپنے قرینے سے ہو گئے۔ میں بھی بیگم سے الگ ہٹ کے مقطع ابن کے بیٹھ گئی۔ جس دالان میں ہم لوگ بیٹھے تھے وہاں سے دروازہ کا سامنا تھا۔ پردہ پڑا ہوا تھا۔ نواب کے انتظار میں اس پردے کی طرف نگاہیں لگی ہوئی تھیں۔ میں بھی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں کسی خدمت گار نے چلا کے کہا نواب صاحب آتے ہیں۔ چند لمحہ کے بعد مہری نے پردہ اٹھا کے کہا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نواب صاحب داخل ہوئے۔

میں (صورت دیکھتے ہی دل میں) وہی تو ہیں (سلطان صاحب) ہے ہے کہ کس موقعہ پر سامنا ہوا ہے۔ نواب کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ پہلے تو کچھ جھجکے پھر بغور میری طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ میں بھی انھیں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں دیکھتا ہوں جوان کی طرف تو حیرت ہے
مری نگاہ کا وہ اضطراب دیکھتے ہیں

اب نواب دالان کے قریب پہونچ گئے اور میری طرف دیکھتے جاتے تھے کہ

بیگم:۔ اوہی نواب دیکھتے کیا ہو وہی ہیں امراو جان جو کانپور......

نواب :۔(انجان بن کے)ہاں میں نے تم سے پرسوں انھیں کا تذکرہ کیا تھا۔

اب فرش کے قریب پہونچ گئے۔سب تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے۔نواب مسند پر بیگم کے پہلو میں اک ذرا سرک کے بیٹھ گئے۔

اب شام ہوگئی تھی۔مہری نے دو کنول سفید روشن کر کے سامنے رکھے۔بیگم پان بنانے لگیں۔اس عرصہ میں نواب نے آنکھ بچا کے میری طرف دیکھا۔میں نے کنکھیوں سے انھیں دیکھا۔اب نہ وہ کچھ کہہ سکتے تھے نہ میں بول سکتی ہوں۔منہ سے بولنے کا موقعہ نہ تھا مگر اس وقت آنکھیں زبان کا کام دے رہی تھیں۔شکوے شکایت،رمزو کنایہ سب اشاروں میں ہوا کیا۔

نواب :۔(کسی قدر اجنبیت سے)امراو جان صاحب!واقعی ہم تو آپ کے بہت ہی ممنون ہیں۔واقعی کانپور میں اس شب کو تمھاری وجہ سے ہمارا گھر لٹنے سے بچ گیا۔

میں :۔یہ آپ کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔ایک اتفاقی امر تھا۔

نواب :۔خیر!جو کچھ ہو وجہ تمہاری تھی۔خیر اسباب تو وہاں کچھ نہ تھا مگر ایک بڑی خیریت ہوگئی۔تمام ضروری کاغذات کوٹھی میں موجود تھے۔

میں :۔کیا کہوں ایسی ہی مجبوری تھی۔لکھنؤ کی جائداد بادشاہ نے ضبط کر لی تھی لاٹ صاحب کے پاس کلکتہ جانا ضرور تھا۔ایسی عجلت میں گیا تھا کہ نہ کچھ سامان کیا،نہ لیا نہ دیا۔صرف شمشیر خاں اور ایک آدمی اور ساتھ لے کے چلا گیا۔

میں :۔وہ کوٹھی ایسے جنگل میں ہے کہ جو واردات نہ ہو تعجب ہے۔

نواب :۔سوائے اس واقعہ کے اور کوئی واردات کبھی نہ ہوئی۔وجہ یہ تھی کہ غدر ہونے کو تھا بد معاشوں نے سر اٹھایا ملک میں اندھیر مچا تھا۔

اس کے بعد اور ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں پھر دستر خوان بچھا۔سب نے مل کے ساتھ کھانا کھایا۔جب حقہ پان سے فراغت ہو چکی تو نواب نے گانے کی فرمائش کی میں نے یہ غزل شروع کی۔

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی	اسی کافر کی ادا یاد آئی
تم کو الفت نہ وفا یاد آئی	یاد آئی تو جفا یاد آئی
ہجر کی رات گزر رہی جاتی	کیوں تری زلفِ رسا یاد آئی
تم جدائی میں بہت یاد آئے	موت تم سے بھی سوا یاد آئی
لذتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ	خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا
لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

اور شعر یاد نہیں مقطع یہ ہے۔

کیا غزل کوئی کہے ہے اے آدا
آج کیوں بادِ صبا یاد آئی

برسات کے دن ہیں پانی جھما جھم برس رہا ہے۔آموں کی فصل ہے،میرے کمرے میں مجمع ہے بسم اللہ جان،امیر جان،بیگا جان،خورشید جان،رنڈیوں میں۔ نواب جّبن صاحب،نواب چھبن صاحب،گوہر مرزا، عاشق حسین،تفضّل حسین، امجد علی،اکبر علی خاں،مردوں میں۔یہ سب صاحب موجود ہیں گانا ہو رہا ہے۔اتنے میں بسم اللہ،بھئی ہو گا گانا تو روز ہوا کرتا ہے،اس وقت تو کڑھائی چڑھاؤ کچھ پکوان پکواؤ۔دیکھو مینہ برس رہا ہے۔

میں:۔اونھ بازار سے جو جی چاہے منگوالو۔

خورشید:۔بازار سے منگوالو یہ خوب کہی۔اپنے ہاتھ سے پکانے میں مزہ ہی اور ہے۔

امیر:۔بہن تمھیں ہنڈیا ٹھوکنے کا مزہ ہے ہم نے نہ تو کبھی پکایا ہے نہ پکانے کی قدر جانتے ہیں۔

بیگا:۔تو پھر وہی بازار کی ٹھہری۔

میں:۔اے ہے باجی کیا بھوکی ہو۔

بیگا:۔میں تو بھوکی نہیں ہوں، بسم اللہ سے پوچھو، انھوں نے صلاح دی تھی۔

بسم اللہ:۔بھئی کچھ نہ کچھ تو آج ہونا چاہیے۔

میں:۔بتاؤں، چلو بخشی کے تالاب چلیں۔

بسم اللہ:۔ہاں بھی کیا بات یہی ہے۔؟

خورشید:۔خوب سیر ہوگی۔

بیگا:۔ہم بھی چلیں گے۔

میں:۔اچھا تو سامان کرو۔

بات کرنے میں تین گاڑیاں کرایہ پر آ گئیں۔ کھانے پکانے کا سامان گاڑیوں پر لدوا دیا گیا۔ دو چھولداریاں نواب جنّن صاحب کے گھر سے آ گئیں۔ سب گاڑیوں پر سوار ہو کے روانہ ہو گئے۔

گومتی پار پہونچ کے گانا شروع ہوا اس دن بیگا جان کا گانا۔

جھولا کن ڈارو رے امریاں

کیا کیا تانیں لی ہیں کہ دل پیا جاتا تھا

شہر سے نکل کے جنگل میں سماں قابلِ دید تھا۔ جدھر نگاہ جاتی ہے سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ بادل چاروں طرف گھرے ہوئے ہیں مینہ برس رہا ہے، درختوں کے پتوں سے پانی ٹپک رہا ہے۔ نالے ندیاں بھری ہوئی ہیں، مور ناچ رہے ہیں، کوئل کوک رہی ہے۔ بات کہتے ہی تالاب پر پہونچ گئے۔ بارہ دری میں فرش کیا گیا، چولھے بن گئے کڑاہیاں چڑھ گئیں، پوریاں تلی جانے لگیں۔ نواب چھٹن صاحب برساتی پہن کے شکار کو نکل گئے۔ گوہر مرزا آموں کی کھانچیاں[1] چکالائے۔ اتنی دیر میں نوکروں نے سڑک کے کنارے باغ میں چھولداریاں گاڑ دیں۔ گاؤں سے چار

پائیاں آگئیں یہاں اور ہی لطف تھے۔آم ٹپک رہے ہیں۔ایک ایک آم پر چار چار آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں۔پانی میں چھپکے لگا رہے ہیں۔کوئی ادھر دوڑا جاتا ہے کوئی ادھر۔آپس میں دھینگا مشتی ہو رہی ہے اب اس میں اگر کوئی گر پڑا تو کیچڑ میں لت پت،تھوڑی دیر پانی میں جا کے کھڑے ہو گئے پھر وہی صاف۔جن کے مزاج میں کسی قدر احتیاط تھی۔جیسے باجی بیگا جان وہ چھولداری میں بیٹھی رہیں۔

بسم اللہ نے پیچھے سے جا کے منہ پر آم کا رس مل دیا پھر اُن کی چیخیں اور سب کا قہقہہ لگانا دیکھنے کا تماشہ تھا۔

نہیں معلوم کہاں سے بہتی بہاتی تین نٹنیاں آنکلیں،ان کو گوانا شروع کیا۔ان کے ساتھ کا ڈھولکی والا غضب کی ڈھولی بجاتا تھا۔بھلا ان کا ناچ گانا ہم لوگوں کو کیا اچھا معلوم ہوتا مگر اس موسم میں اور ویسی جگہ کچھ ایسا نامناسب نہ تھا۔دو گھڑی دن رہے ہماری قسمت سے آسمان کھل گیا،دھوپ نکل آئی۔ہم لوگ احتیاطاً ایک ایک جوڑا گھر سے لیتے آئے تھے۔سب نے کپڑے بدلے جنگل کی سیر کو نکلے۔

میں بھی اکیلی ایک طرف روانہ ہوئی۔سامنے گنجان درخت تھے،سورج انھیں گنجان درختوں کی آڑ میں ڈوب رہا تھا۔سبزے پر سنہری کرنوں کے پڑنے سے عجیب کیفیت تھی۔جا بجا جنگلی پھول کھلے تھے۔چڑیاں بسیرے کی تلاش میں اِدھر اُدھر اڑ رہی تھیں۔سامنے جھیل کے پانی پر آفتاب کی شعاع سے وہ عالم نظر آتا تھا جیسے پگھلا ہوا سونا جھلک رہا ہے۔درختوں کے پتوں کی آڑ میں سورج کی کرنیں اور ہی عالم دکھا رہی ہیں۔آسمان پر سرخ شفق پھولی ہوئی تھی۔اس وقت کا سماں ایسا تھا کہ خفقانی مزاج کی عورت جیسی کہ میں ہوں،جلدی سے چھولداری سے چلی آئی۔یہ تماشہ دیکھتی ہوئی خدا جانے کتنی دور نکل گئی۔کوئی بیلوں کو ہانکتا ہوا چلا آتا تھا۔ایک چھوٹی سے لڑکی گائے بھینس لیے ہوئے چلی جاتی تھی۔ایک لڑکا بہت سی بھیڑیں اور بکریوں کے پیچھے تھا۔یہ سب آنکھوں کے سامنے آئے اور پھر نظروں سے غائب

ہو گئے۔ میں پھر اکیلی رہ گئی۔ نہیں معلوم کس دھن میں تھی۔ مگر اب میں سڑک پر چلنے لگی۔ اپنے نزدیک میں اب گویا تالاب کی طرف چل رہی ہوں۔ اب اندھیرا ہوتا جاتا ہے سورج ڈوبنے ہی کو ہے۔ اب میرا قدم جلد جلد اٹھ رہا ہے۔ آگے چل کر ایک فقیر کا تکیہ ملا۔ یہاں کچھ لوگ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ یہاں میں نے تالاب کا راستہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ میں لکھنؤ کی سڑک پر جارہی ہوں تالاب دہنے کو چھوٹ گیا ہے۔ یہاں سڑک چھوڑنا پڑی۔ ایک بیہڑ میں سے ہو کے راستہ تھا۔ تھوڑی دور جا کے ایک نالہ ملا۔ نالہ کے اُس پار تھوڑے فاصلہ پر دو تین درخت تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان درختوں کی جڑ سے اک ذرا ہٹ کے کوئی شخص میلی سی دھوتی باندھے، مرزئی پہنے ایک میلا سا چادرہ کمر سے لپٹا ہوا کھرپی ہاتھ میں لیے کچھ کھود رہا ہے میری اس شخص کے چار آنکھیں ہوئیں۔ پہلے تو کچھ شبہ سا ہوا پھر ایک مرتبہ غور سے دیکھا اب قریب یقین کے ہو گیا کہ وہی ہے۔ چاہتی تھی کہ منہ پھیر لوں مگر نگاہ کمبخت اسی طرف لڑی رہی۔ اب تو بالکل یقین ہو گیا قریب تھا کے غش کھا کے گر پڑوں اور ضرور ہی گر پڑتی۔ اتنے میں دور سے اکبر علی خاں کے نوکر سالار بخش کی آواز کان میں آئی۔ مجھے ڈھونڈنے نکلا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر دلاور خاں نے کھرپی ہاتھ سے رکھ دی تھی۔ جس طرح میں اُسے دیکھ رہی تھی وہ بھی مجھ کو دیکھ رہا تھا مگر یقیناً مجھے اس نے نہ پہچانا ہوگا۔ میں نے اس کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔

سالار بخش کی آواز سن کر وہ نالے کی طرف بھاگا۔ اتنے میں سالار بخش میرے پاس پہونچ گیا۔ میں مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ آواز منہ سے نہیں نکلتی تھی۔ گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ سالار بخش نے میرا یہ حال دیکھ کر کہا۔ ہائیں! ڈر گئیں۔ میں نے درخت کی طرف اشارہ کیا۔ سالار بخش اس طرف دیکھنے لگا۔

سالار بخش: ۔ وہاں کیا دھرا ہوا ہے؟ ایک کھرپی پڑی ہے۔ وہ اس سے ڈر گئیں۔ آپ سمجھیں کوئی قبر کھود رہا ہے اور وہ گیا کہاں جو کھود رہا تھا۔

میں :۔منہ سے تو بولا نہ گیا، ہاتھ سے نالے کی طرف اشارہ کیا۔

سلار بخش :۔ چلم پینے گیا ہوگا تکیے پر۔ اچھا تو چلیے، نواب چھبن صاحب بہت سی مرغابیاں ں شکار کر کے لائے ہیں۔ آپ کا کہیں پتہ نہیں۔ میاں ادھر ڈھونڈ نے گئے ہیں۔ میں ادھر آیا۔ کہیے آپ مل گئیں نہیں تو آپ کو راستہ نہ ملتا۔

میں نے ہاں، نا کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ آخر سلار بخش بھی چپ ہو رہا۔ تھوڑی دیر میں کھیتوں میں سے ہو کے تالاب پر پہونچ گئی۔

رات کو یہیں رہنے کی ٹھہری۔ جب کھانے دانے سے فراغت ہوگئی میں نے اکبر خاں سے کل واقعہ بیان کیا۔

اکبر علی خاں :۔تم نے اچھی طرح سے دیکھا یہ وہی دلاور خاں تھا فیض آباد کا رہنے والا ؟ اس کا تو حلیہ جاری ہے۔افسوس تم نے پہلے سے نہ کہا۔ بدمعاش کو چل کر گرفتار کرتے، بڑا نام ہوتا، سرکار سے انعام ملتا۔ ایک ہزار کا اشتہار ہے اور یہ کھودتا کیا تھا؟

میں :۔کیا معلوم؟ موا اپنی قبر کھودتا ہوگا۔

اکبر علی خاں :۔اس کے نام سے تمہارے منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگتی ہیں۔ اب وہ تمہارا کیا کر سکتا ہے؟

میں :۔(دل کو ذرا تھام کے) ضرور اس نے غدر کے زمانے میں وہاں کچھ گاڑ دیا ہوگا اسے کھودنے آیا ہے۔

اکبر علی خاں :۔چلو دیکھیں!

میں :۔میں تو نہ جاؤں گی۔

اکبر علی خاں :۔میں تو جاتا ہوں۔ سلار بخش کو لیے جاتا ہوں۔

میں :۔کہاں جاؤ گے اب وہاں کچھ دھرا ہوگا؟ وہ کھود کے لے بھی گیا ہوگا۔

اکبر علی خاں :۔میں تو ضرور جاؤں گا۔

یہ ذرا زور سے کہا۔ پاس نواب چھبن صاحب کی چھولداری تھی ۔وہ اور بسم اللہ دونوں جاگ رہے تھے۔

نواب:۔خاں صاحب کہاں جایئے گا؟

اکبرعلی خاں:۔نواب صاحب ابھی آپ نے آرام نہیں کیا؟

نواب:۔جی نہیں۔

اکبرعلی خاں:۔میں حاضر ہوں۔

نواب:۔آیئے۔

اکبرعلی خاں اور میں دونوں کی چھولداری میں گئے۔کل واقعہ بیان کیا۔

نواب:۔(مجھ سے)اورتم اس بدمعاش کو کیا جانو؟

میں:۔(اپنی سرگزشت تو ان سے کیا کہتی) میں جانتی ہوں اور اچھی طرح جانتی ہوں۔میں بھی فیض آباد کی رہنے والی ہوں۔

نواب:۔اخاہ! آپ بھی فیض آباد کی رہنے والی ہیں۔

اکبرعلی خاں:۔مگراس مردود کا کوئی بندوبست کرنا چاہیے۔ایسے میں یہیں کہیں ہے۔ عجب نہیں گرفتار ہو جائے۔ یہ کہہ کے سالار بخش کو آواز دی۔قلم دان منگوایا، تھانہ قریب تھا۔تھانہ دار کو رقعہ لکھا۔

تھوڑی دیر میں تھانہ دار صاحب معہ دس بارہ سپاہیوں کے آموجود ہوئے۔ میں نے جو دیکھا تھا ان سے کہہ دیا۔گاؤں سے پاسی بلوائے گئے۔پہلے اُس موقعہ پر جاکے ڈھونڈھا تکیہ پر پرفقیر سے کسی قدر سراغ اور ملا۔ایک سپاہی کو ایک اشرفی شاہی زمانے کی ملی۔وہ تھانہ دار صاحب کے پاس لے آیا۔

تھانے دار:۔خدا چاہے تو معہ مال گرفتار ہوگا۔

تھانے دار نے واقعی اچھا بندوبست کیا۔سپاہیوں نے بھی خوب ہی تگ ودو کی۔آخر تین بجے رات کو مکا گنج میں گرفتار ہوا۔صبح ہوتے ہوتے تالاب پہونچ

گیا۔ تلاشی میں ۲۴ اشرفیاں برآمد ہوئیں۔ میں نے شناخت کے لیے بلوائی گئی۔ میری شناخت کے علاوہ دو سپاہیوں نے بھی پہچانا۔ دس بجے چالان لکھنؤ کو روانہ ہوگیا۔

مرزا رسوا: ۔اچھا تو پھر اس کا حشر کیا ہوا؟ اس قصے کو جلدی ختم کیجیے۔

امراو: ۔ہوا کیا۔ کوئی دو مہینے کے بعد معلوم ہوا پھانسی ہوگئی۔ واصلِ جہنم ہوا۔

نہ پوچھو نامۂ اعمال کی دل آویزی

تمام عمر کا قصہ لکھا ہوا پایا

مرزا رسوا صاحب جب آپ نے میری سوانح عمری کا مسودہ مجھے نظر ثانی کرنے کے لیے دیا تھا، مجھے ایسا غصہ آیا کہ جی چاہتا تھا پرزے پرزے کر کے پھینک دوں۔ بار بار خیال آتا تھا کہ زندگی میں کیا کم روسیاہی ہوئی کہ اس کا افسانہ بعد مرنے کے بھی باقی رہے کہ لوگ اسے پڑھیں اور مجھ کو لعنت ملامت کریں مگر مزاج کی تساہلی اور آپ کی محنت کے لحاظ نے ہاتھ روک لیا۔

اتفاقاً کل شب کو بارہ بجے کے قریب سوتے سوتے آنکھ کھل گئی میں حسب معمول کمرے میں تنہا تھی۔ مامائیں خدمت گار سب نیچے مکان میں سو رہے تھے، میرے سرہانے لیمپ روشن تھا۔ پہلے تو دیر تک کروٹیں بدلا کی۔ چاہتی تھی سو جاؤں مگر کسی طرح نیند نہ آئی۔ آخر اٹھی پان لگا کر ماما کو پکارا حقہ بھروایا پھر پلنگ پر جالیٹی حقہ پینے لگی۔ جی میں آیا کوئی کتاب دیکھوں۔ بہت سے قصے کہانی کی کتابیں سرہانے الماری میں رکھی تھیں۔ ایک ایک کو اٹھا کے ورق الٹے پلٹے مگر وہ سب کئی مرتبہ کی دیکھی ہوئی تھیں۔ جی نہ لگا بند کر کے رکھ دیں۔ آخر اسی مسودے پر ہاتھ پڑا۔ خفقان کی شدت تھی۔ سچ مچ میں نے اس کے چاک کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

چاک ہی کیا چاہتی تھی کہ یہ معلوم ہوا جیسے کان میں کوئی کہہ رہا ہے۔

اچھا امراؤ بالفرض اسے تم نے پھاڑ کے پھینک دیا، جلا دیا تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ تمام عمر کے واقعات جو خدائے عادل و توانا کے حکم سے فرشتوں نے مفصل اور مشرح لکھے ہیں انھیں کون مٹا سکتا ہے؟

اس غیبی آواز سے میرے ہاتھ پاؤں لرزتے لگے۔قریب تھا کہ مسودہ ہاتھ سے گر پڑے مگر میں نے اپنے تئیں سنبھالا۔چاک کرنے کا خیال تو بالکل دل سے محو ہو گیا۔جی چاہا جہاں اسے اٹھایا تھا وہیں رکھ دوں۔پھر ایک بارگی یوں ہی بلا قصد پڑھنا شروع کیا۔پہلا صفحہ جب تمام ہو گیا ورق الٹا، دو چار سطریں اور پڑھیں۔اس وقت مجھے اپنی سرگزشت سے کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ جس قدر بڑھتی جاتی تھی جی چاہتا تھا اور پڑھوں۔اور قصوں کے پڑھنے میں مجھے ایسا لطف کبھی نہ آیا تھا کیونکہ ان کو پڑھتے وقت یہ خیال پیش نظر رہتا تھا کہ یہ سب بنائی ہوئی باتیں ہیں۔در حقیقت کوئی اصل نہیں۔یہی خیال قصے کو بے مزہ کر دیتا ہے۔میری سوانح عمری میں جو امور آپ نے قلم بند کیے ہیں وہ سب مجھ پر گزرے ہیں۔اس وقت وہ سب گویا میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ہر واقعہ اصلی حالت میں نظر آتا تھا اور اس سے طرح طرح کے اثرات میرے دل و دماغ پر طاری تھے جن کا بیان بہت ہی دشوار ہے اگر کوئی مجھے اس حالت میں دیکھتا تو اس کو میری دیوانگی میں کوئی شک نہ رہتا۔کبھی تو میں بے اختیار ہنس پڑتی تھی کبھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے تھے۔غرضیکہ عجیب کیفیت تھی۔آپ نے فرمایا جا بجا بناتی جانا، یہاں اس کا ہوش کسے تھا۔پڑھتے پڑھتے صبح ہو گئی۔اب میں نے وضو کیا، نماز پڑھی پھر تھوڑی دیر سوئی صبح کو کوئی آٹھ بجے آنکھ کھلی، ہاتھ منہ دھو کے پڑھنے لگی۔بارے سرِ شام سارا مسودہ پڑھ چکی۔

تمام قصہ میں وہ تقریر آپ کی مجھے بہت ہی دل چسپ معلوم ہوئی۔جہاں آپ نے نیک بختوں اور خراب عورتوں کا مقابلہ کرکے ان کا فرق بتایا ہے۔نیک

بخت عورتوں کو جس قدر فخر ہو زیبا ہے اور ایسی بازاریوں کو ان کے اس فخر پر بہت ہی رشک کرنا چاہیے مگر اس کے ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ اس باب میں بخت و اتفاق کو بھی بہت دخل ہے۔ میری خرابی کا سبب وہی دلاور خاں کی شرارت تھی۔ نہ وہ مجھے اٹھا لاتا ورنہ اتفاق سے خانم کے ہاتھ فروخت ہوتی نہ میرا یہ لکھا پورا ہوتا۔ جن امور کی برائی میں اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا اور اسی لیے ایک مدت ہوئی کہ میں اُن سے بیزار اور تائب ہوں، اس زمانے میں ان کی حقیقت مجھے کسی طرح نہیں معلوم ہو سکتی تھی، نہ ایسا کوئی قانون مجھے بتایا گیا تھا کہ میں اُن سے اجتناب کرتی اور ایسا نہ کرتی تو مجھے سزا دی جاتی۔ میں خانم کو اپنا مالک اور حاکم تصور کرتی تھی۔ میں کوئی کام ایسا نہ کرتی تھی جو اُن کی مرضی کے خلاف ہو اور اگر کرتی تھی بھی تو بہت چھپا کے تا کہ ان کی مار جھڑکیوں سے بچ سکوں، اگرچہ خانم نے مجھے زندگی بھر پھول کی چھڑی بھی نہیں چھوائی مگر خوف غالب تھا۔

جن لوگوں میں میں نے پرورش پائی تھی جو اُن کا طریقہ تھا وہی میرا بھی تھا۔ میں نے اس زمانے میں کبھی کسی مذہبی عقیدے پر غور نہیں کیا اور میرا خیال ہے کہ کوئی ایسی حالت میں نہ کرتا۔

ارضی و سماوی حادثے جن کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے مگر جو ہوتے ہیں تو دلوں میں ایک خاص قسم کی دہشت سما جاتی ہے مثلاً زور سے بادل کا گرجنا، بجلی کا چمکنا، آندھیوں کا آنا، اولوں کا گرنا زلزلے کا آنا، سورج گرہن یا چاند گرہن، قحط سالی، وبا وغیرہ ایسے امور اکثر خدائی غضب کی علامتیں سمجھی جاتی تھیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ لوگوں کے بعض اعمالوں کی وجہ سے وہ رفع دفع ہو گئیں مگر یہ بھی دیکھا کہ بہت سی آفتیں دعا تعویذ ٹوٹکے کسی بات سے نہ ٹلیں ایسے امور کو لوگ خدا کی مرضی، تقدیرِ آسمانی کی طرف منسوب کر دیا کرتے ہیں۔ مذہبی احکام مجھ کو مفصل نہ پہونچے تھے اور نہ ثواب عذاب کا مسئلہ اچھی طرح سمجھایا گیا تھا۔ اس لیے ان باتوں کا اثر

میرے دل پر نہ تھا۔ بے شک اُس زمانہ میں میرا کوئی مذہب نہ تھا۔ صرف جو اور لوگوں کو کرتے دیکھتی تھی وہی آپ بھی کرنے لگتی تھی۔ اس وقت میں میرا کوئی مذہب نہ تھا۔ تقدیر پر میں بہت ہی شاکر تھی۔ جو کام میں کاہلی سے نہ کر سکتی تھی یا میری بے وقوفی سے بگڑ جاتا اس کو تقدیر کے حوالے کر دیتی۔ فارسی کتابوں کے پڑھنے سے آسمان کی شکایت کرنے کا مضمون میرے ہاتھ آ گیا تھا اور جب میرا کوئی مطلب فوت ہو جاتا تھا اور کسی وجہ سے مجھے ملال پہونچتا تھا تو جا و بے جا فلک کی شکایتیں کیا کرتی تھی۔

هم بھی ہیں مختار لیکن اس قدر ہے اختیار
جب ہوئے مجبور قسمت کو برا کہنے لگے

مولوی صاحب بو احسینی اور بڈھے بڑھیاں جب اگلے زمانے کی باتیں کرتے تھے تو اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس زمانے سے بہت ہی اچھا تھا اس لیے ان کی طرح میں بھی اس زمانہ کی غائبانہ تعریف اور زمانہ موجودہ کی بلاوجہ مذمت کیا کرتی تھی۔ میں کم بخت اس بات کو نہ سمجھی کہ بڈھے بڑھیاں جو اگلے وقتوں کی تعریف کرتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ اپنی اپنی جوانی کے دن سب کو بھلے معلوم ہوتے ہیں اس لیے دنیا بھی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ خود زندہ جہان زندہ، خود مردہ جہان مردہ۔ سن رسیدہ لوگوں کی دیکھا دیکھی جوانوں نے بھی انھیں کا وتیرہ اختیار کر لیا ہے اور چوں کہ یہ غلط فہمی مدت سے چلی آتی ہے اس لیے اب عموماً سب کو اس کی عادت سی ہو گئی ہے۔

جوان ہونے کے بعد میں عیش و آرام میں پڑ گئی تھی۔ اس زمانے میں گا بجا کر مردوں کو رجھانا میرا خاص پیشہ تھا۔ اس میں بمقابلہ اور ساتھ والیوں کے جس قدر کامیابی یا ناکامیابی مجھ کو ہوتی تھی وہی میری خوشی یا رنج کا اندازہ تھا۔ میری صورت

بہ نسبت اوروں کے کچھ اچھی نہ تھی مگر فن موسیقی کی مہارت اور شعر و سخن کی قابلیت کی وجہ سے میں سب سے بڑھی چڑھی رہی۔ اپنی ہم عمروں میں مجھے ایک خاص قسم کا امتیاز حاصل تھا مگر اس سے کچھ نقصان بھی ہوا، وہ یہ کہ جس قدر میری عزت زیادہ ہوتی گئی اتنا ہی خودداری کا خیال میرے دل میں پیدا ہوتا گیا۔ جہاں اور رنڈیاں بے باکیوں سے اپنا مطلب نکال لیتی تھیں میں منہ دیکھتی رہ جاتی تھی۔ مثلاً ان کا یہ عام قاعدہ تھا کہ ہر کس و ناکس سے کسی نہ کسی قسم کی فرمائش ضرور کر دینا چاہیے۔ مجھے اس سے شرم آتی تھی۔ یہ خیال آتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ انکار کر دے تو خفت ہوگی اور نہ ہر شخص سے میں بہت جلد بے تکلف ہو جاتی تھی۔ میری اور ساتھ والیوں کے پاس جب کوئی آ کے بیٹھتا تھا تو ان کو سب سے زیادہ فکر اس کی ہوتی تھی کہ کہاں تک دے سکتا ہے اور ہم کہاں تک اس سے لے سکتے ہیں؟ میرا بہت سا بہت وقت اس شخص کی ذاتی لیاقت، حسن اخلاق کا اندازہ کرنے میں صرف ہو جاتا تھا۔ مانگنے کی عادت کو میں معیوب سمجھنے لگی تھی۔ اس کے علاوہ اور باتیں بھی مجھ میں رنڈی پنے کی نہ تھیں اس لیے میری ساتھ والیوں میں سے کوئی مجھے ناک چوٹی گرفتار، کوئی خفقانی، کوئی دیوانی سمجھتی تھی مگر میں نے اپنی کی کسی کی نہ سنی۔

پھر وہ زمانہ آیا کہ میں رنڈی کے ذلیل پیشے کو عیب سمجھنے لگی اور اس سے دستبردار ہوگئی۔ ہر کس و ناکس سے ملنا چھوڑ دیا۔ صرف ناچ مجرے پر بسر اوقات رہ گئی۔ کسی رئیس نے نوکر رکھا تو نوکری کر لی۔ رفتہ رفتہ ترک کر دیا۔

جب میں ان افعال سے تائب ہوئی جن کو میں نے اپنے نزدیک برا سمجھ لیا تھا تو ایک بار میرے جی میں آیا کہ کسی مرد آدمی کے گھر پڑ جاؤں۔ لیکن پھر یہ خیال آیا کہ لوگ کہیں گے آخر رنڈی تھی نا کفن کا چونگا کیا۔

مرزا صاحب شاید اس محاورے کو آپ نہ سمجھیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ کوئی رنڈی سن سے اتر کر کسی کے گھر بیٹھ جاتی ہے تو تجربہ کار تماشبین اس کی نسبت کہا

کرتے ہیں کہ اس رنڈی نے کفن کا چونگا کیا یا مرتے مرتے کفن لے مری یعنی اپنے دام بجائے اور از راہِ فریب تماشبین پر اپنی تجہیز و تکفین کا بار ڈالا۔ اس مثل سے رنڈیوں کی بے حد خود غرضی، لالچ اور فریب کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہم لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ میں سچ مچ تائب ہوگئی اور اب انتہا کی نیک ہوں مگر اس کو سوائے خدا کے اور کون جانتا ہے کسی شخص کو میری نیکی کا یقین نہیں ہوسکتا۔ پھر اگر اس حالت میں کسی سے محبت کروں اور اُس محبت کی بنا سراسر خلوص اور نیک نیتی پر ہو اس پر بھی خاص وہ شخص اور اس کے سوا اور جو لوگ دیکھیں یا سنیں گے، کبھی یقین نہ لائیں گے پھر میرا محبت کرنا بھی بے سود ہوگا۔ لوگ مشہور کرتے ہیں کہ میرے پاس دولت ہے اس لیے اکثر لوگ اس سن میں بھی میری خواہش کرتے ہیں اور طرح طرح کے فریب مجھ کو دینا چاہتے ہیں۔ کوئی صاحب میرے حسن و جمال کی تعریف کرتے ہیں اگر چہ ان کا تعلق میں ایسی رنڈیوں سے سن چکی ہوں جو بدر جہا مجھ سے بہتر ہیں کوئی صاحب میرے کمال موسیقی پر غش ہیں حالانکہ ان کے کان تال سم سے آشنا نہیں۔ کوئی میری شاعری کے مداح ہیں جنھوں نے عمر بھر بھی ایک مصرع موزوں کہنا تو کیسا پڑھا بھی نہ ہوگا۔ ایک صاحب میری علمیت کے قائل ہیں خود بھی پڑھے لکھے ہیں مگر مجھ کو مولانا بالفضل اولا سمجھتے ہیں۔ معمولی مسئلے روزہ نماز کے بھی مجھی سے پوچھ لیا کرتے ہیں۔ گویا کہ آپ میرے مرید یا مقلد ہیں۔ ایک میرے عاشق زار میری دولت و کمال سے کوئی واسطہ نہیں، صرف میری تندرستی کے خواہاں ہیں۔ ہر بات پر اللہ آمین۔ مجھے چھینک آئی اور ان کے دردسر ہونے لگا، مجھے دردسر ہوا اور ان کے دشمنوں کا دم نکلنے لگا۔ ایک بزرگِ ناصح مشفق بنے ہیں دنیا کے نشیب و فراز سمجھایا کرتے ہیں۔ مجھ کو بہت ہی بھولا سمجھتے ہیں۔ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں جیسے کوئی دس گیارہ برس کی لڑکی سے باتیں کرتا ہو۔

میں ایک گھاگ عورت ہوں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے جو جس طرح بناتا ہے بن جاتی ہوں اور درحقیقت ان کو بناتی ہوں۔ خلوص کے ساتھ بھی ملنے والے دو ایک صاحب ہیں بے غرض ملتے ہیں، ان کا مقصود صرف ایک مذاقِ خاص ہے، مثلاً شعر وسخن یا گانا بجانا صرف لطف گفتگو نہ ان کی کوئی غرض مجھ سے ہے، نہ مجھے کوئی غرض ان سے ہے۔ ایسے لوگوں کو دل میں سے چاہتی ہوں اور بے غرضی رفتہ رفتہ ایک غرض ہوگئی ہے کہ نہ مجھے ان کے بغیر چین آتا ہے اور نہ انھیں بغیر میرے۔ مگر ان لوگوں میں سے کوئی میرے گھر میں بٹھانے کا امیدوار نہیں ہے۔ کاش کہ ایسا ہوتا! مگر یہ تمنا ایسی ہے جیسے کوئی کہے کاش کہ جوانی پھر آتی! اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کی زندگی جوانی تک ہے۔ اگر جوانی کے ساتھ ہی زندگی بھی ختم ہو جایا کرتی تو کیا خوب ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ یوں تو بڑھاپا ہر ایک کے لیے برا ہے خصوصاً عورت کے لیے۔ خصوصاً رنڈی کے لیے بڑھاپا دوزخ کا نمونہ ہے۔ بڑھیا فقیرنیاں جو لکھنؤ کے گلی کوچوں میں پڑی پھرتی ہیں اگر غور کیجیے گا تو ان میں اکثر رنڈیاں تھیں۔ رنڈیاں بھی کون سی جو کبھی زمین پر پیر نہ رکھتی تھیں، قیامت برپا کر رکھی تھی۔ ہزاروں بھرے پرے گھر تباہ کر دیے۔ سیکڑوں جوانوں کو بے گناہ قتل کیا۔ جہاں جاتی تھیں لوگ آنکھیں بچھاتے تھے۔ اب کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔ پہلے جہاں بیٹھ جاتی تھیں لوگ باغ باغ ہو جاتے تھے۔ اب کوئی کھڑے ہونے کا بھی روادار نہیں۔ پہلے بن مانگے موتی ملتے تھے اب مانگے بھیک نہیں ملتی۔

ان میں سے اکثر اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا باعث ہوئیں۔ ایک بڑی بی میرے مکان پر کبھی کبھی آیا کرتی تھیں۔ کسی زمانے میں بڑی مشہور رنڈیوں میں تھیں۔ جوانی میں ہزاروں روپے کمائے۔ ذرا مزیدار جیوڑا تھا۔ جب سن سے اتریں وہی کمائی یاروں کو کھلانا شروع کی۔ بڑھاپے میں ایک نوجوان کے گھر

بیٹھیں۔ایک تو وہ خوبصورت کم سن بھلا وہ ان پر کیوں ریجھتا۔ پہلے تو بیوی ذرا بگڑیں مگر جب میاں نے اصل مطلب سمجھا دیا، خاموش ہو رہیں۔ان کی خاطریں ہونے لگیں۔ جب تک مال رہا خوب میاں بیوی دونوں نے پھسلا کے کھایا آخر کھاکھ ہو گئیں۔اب کون پوچھتا ہے۔نکال باہر کیا۔گلیوں کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔

بعض بے وقوف رنڈیوں نے کسی کی لڑکی کو لے کے پالا، اس سے دل لگایا (اس حماقت میں بھی گرفتار ہو چکی ہوں) مگر جب وہ جوان ہوئی لے کے کسی کے ساتھ نکل گئی یا اگر رہی تو کل مال رفتہ رفتہ اپنے قبضے میں کیا۔ان کو گھر کا انتظام یا ماما گیری کرنے کو رکھ لیا۔

آبادی نے یہی جل دیا ہوتا مگر وہ اس کے کرتوت پہلے ہی کھل گئے۔نہیں تو مجھے لوٹ ہی لے جاتی۔مرد کیا اور عورت کیا رنڈی کی قوم میں بدکاروں کی زندگی کا اصول ہی ایسا بگڑا ہوا ہے کہ ایک دوسرے میں محبت نہیں ہو سکتی تھی نہ کوئی سمجھدار مرد ہی ان کو دل دے سکتا ہے۔کیوں کہ سب جانتے ہیں کہ رنڈی کسی کی نہیں ہوتی اور نہ عورت ہی ایسی محبت کر سکتی ہے۔نوچیاں اپنے دل میں یہ سمجھتی ہیں کہ کماتے ہم ہیں ان کو کیوں دیں۔

اگلے قدردان مرد زوالِ حسن کے بعد کنارہ کرتے ہیں۔ یہ ان کی عادت ہوتی ہیں کہ لوگ جھوٹی خوشامد کریں بھلا ان کی کوئی خوشامد کیوں کرنے لگا، غرض کہ مرد اُن سے کنارہ کش اور یہ مردوں سے شاکی رہتی ہیں۔

پہلے پہل میں بھی اور رنڈیوں کی زبانی مردوں کی بے وفائی کا دکھڑا سن کے وقت ضائع کرتی تھی اور بے سمجھے ان کی ہاں میں ہاں ملا دیتی تھی مگر باوجود اس کے کہ گوہر مرزا نے میرے ساتھ جو کچھ سلوک کیا وہ سب آپ کو معلوم ہے اور نواب صاحب جنھوں نے مجھ پر نکاح کا الزام لگایا تھا اس کو بھی آپ سن چکے پھر بھی

مردوں کو بے وفا نہیں کہہ سکتی۔ اس معاملہ میں عورتیں خصوصاً بازاروالیاں اُن سے کسی طرح کم نہیں۔ محبت کے باب میں مرد (معاف کیجیے گا) اکثر بے وقوف اور عورتیں بہت ہی چالاک ہوتی ہیں۔ اکثر مرد سچے دل سے اظہار عشق کرتے ہیں اور اکثر عورتیں جھوٹی محبت جتاتی ہیں۔ اس لیے کہ مرد جس حالت میں اظہارِ عشق کرتے ہیں وہ حالت اُن کی اضطراری ہوتی ہے اور عورتیں بہت جلد متاثر نہیں ہوتیں کیونکہ مرد بہت ہی جلد عورتوں کے حسنِ ظاہری پر فریفتہ ہوکر ان پر شیدا ہو جاتا ہے اور عورتیں اس باب میں زیادہ احتیاط کرتی ہیں۔ اسی لیے مردوں کی محبت کسی قدر سریع[1] الزوال اور عورتوں کی محبت عسیر[2] الزوال، مگر جانبین کے حسن معاشرت سے ان امور میں ایک خاص قسم کا اعتدال پیدا ہو سکتا ہے بشرطیکہ دونوں یا کم از کم ایک کو سمجھ ہو۔

واقعی مرد اس باب میں سریع الاعتقاد ہوتے ہیں اور عورتیں انتہا کی شکی۔ مرد پر عورت کا جادو بہت جلد چل جاتا ہے مگر عورت پر حب کا عمل مشکل سے کارگر ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہ نقص فطرت کی طرف سے ہے اس لیے کہ عورتیں ضعیف القویٰ ہیں، ان کو بعض وصف ایسے دیے گئے ہیں جس سے یہ کمی پوری ہو جائے۔ منجملہ ان اوصاف کے ایک وصف یہ بھی ہے بلکہ میں کہہ سکتی ہوں شاید یہی ایک وصف ہے۔ اس کی مثال جانوروں میں بھی مل سکتی ہے اکثر ضعیف جانوروں میں بھی یہ حیلہ گری کا مادہ ہے۔

اکثر مرد یہ کہیں گے کہ عورتیں حسین ہوتی ہیں۔ میں اس کی قائل نہیں۔ درحقیقت نہ مرد ہی بجائے خود حسین ہے نہ عورت بلکہ ہر ایک کو ایسا حسن عنایت ہوا ہے جو دوسرے کو اچھا معلوم ہو۔ یوں تو مرد عورت کا ناک نقشہ اچھا ہوتا ہے سب اسے پسند کرتے ہیں مگر اصل قدردان مرد کے حسن کی عورت اور عورت کے حسن کا مرد ہے۔ ایک خوبصورت عورت دوسری خوبصورت عورت کے سامنے اس خوش رنگ پھول سے زیادہ نہیں ہے جس میں خوشبودار پھول کی طرح دل پسند ہے اگرچہ

اس کی شکل اور رنگت میں کوئی ندرت نہ ہو۔ محبت کے باب میں میں غلطی صرف ایک ہی سے نہیں ہوتی بلکہ دونوں اس باریکی کو نہیں سمجھتے۔ ان دونوں محبتوں کی اصلیت میں فرق ہے جس نگاہ سے مرد عورتوں کو دیکھتے ہیں اس نگاہ سے عورت مرد کو دیکھتی ہی نہیں۔ عورتوں کی محبت کرنے کا اندازہ اُن سے مردوں میں ایک حد تک پایا جاتا ہے جو کسی مالدار عورت کے دامنِ دولت سے وابستہ ہے یا جس کا سن بہت کم ہے مگر کوئی سنِ رسیدہ عورت ان کو چاہنے لگی۔

اس میں شک نہیں کہ عورتیں جوان مرد سے بہ نسبت بڈھوں کے زیادہ محبت رکھتی ہیں مگر اس کی وجہ بھی محض حسن و جمال نہیں ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ عورت ضعیف القویٰ ہے اس لیے وہ ہر حالت میں اپنے حمایتی کو بہت دوست رکھتی ہے تاکہ وقت ضرورت اُس کو خطرے سے بچا سکے۔ پس جوان سے بہ نسبت بڈھے کے زیادہ توقع ہے اور حسن و جمال اس خوبی کے ساتھ مل کر اس کے وصف کو رونق دیتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مرد کی محبت میں صرف لذت حاصل کرنا مقصود ہے اور عورت کی محبت میں الم سے محفوظ رہنا اور لذت دونوں غرضیں شامل ہیں۔

چونکہ یہ مشہور ہے کہ محبت بے غرض ہونا چاہیے اور عورت کی محبت میں اس کا زیادہ لگاو ہے لہذا وہ اس کے چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ شاید یہ کوئی کہے کہ جو امور میں نے اس موقع پر بیان کیے ہیں اس میں اکثر باتوں کا امتیاز نہ مردوں کو ہوتا ہے نہ عورتوں کو تو میں اسے تسلیم کرلوں گی اور یہ کہوں گی کہ یہ باتیں اصل فطرت سے مرد عورت کے خمیر میں داخل ہیں۔ کچھ ضرورت نہیں ہے کہ انھیں اس کا شعور بھی ہو۔

میں نے عمر بھر کے تجربہ کے بعد یہ امور دریافت کیے ہیں اور میرے ساتھ جو شخص اس پر غور کرے گا وہ اسے سمجھ سکتا ہے۔

میں دیکھتی ہوں کہ اکثر عورتیں اور ناخواندہ مرد بھی ایسی باتوں پر غور نہیں

کرتے اسی لیے ان کو اپنے زمانۂ زندگی میں بہت سی بک بک جھک جھک کرنا پڑتی ہے۔

میرے خیال میں مرد عورت دونوں اپنے اپنے رتبے اور اغراض کو سمجھ لیں تو ان میں ہرگز ملال نہ ہو۔ بہت سی آفتیں ٹل جائیں اور بہت سے دکھ دور ہو جائیں۔ مگر ایک مشکل ہے کہ جب کسی کو کسی بات کی فہمایش کی جائے تو اکثر یہی جواب ملتا ہے:

''اوہ جی! جو تقدیر میں ہوگا ہو رہے گا۔'' اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم جو چاہیں کریں ہمیں نہ روکو، ہمارے کیے کچھ نہیں ہوتا، یعنی ہماری بدکاریوں کا کوئی نتیجہ نہیں ہے جو کچھ ہوگا تقدیر سے ہوگا، جو نتیجہ نکلے گا وہ معاذ اللہ خدا کی طرف سے ہوگا۔ یہ لغو گفتگو اگلے زمانہ میں کسی قدر بامعنی بھی تھی۔ کیوں کہ اس زمانہ میں اتفاق سے گھڑی بھر میں کچھ نہ کچھ ہو جایا کرتا تھا۔ اس پر مجھے شاہی زمانے کی ایک نقل یاد آئی ہے۔

زمانۂ شاہی میں انقلاب کا ثبوت اکثر ملتا رہتا تھا۔ لوگوں کی حالتوں میں دفعتاً تغیر ہو جایا کرتا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے ایک سپاہی نہایت ہی شکستہ حال موتی محل کے پھاٹک کے پاس چبوترے پر پڑا سو رہا تھا۔ قضائے کار نماز صبح کے بعد ٹہلتے ہوئے بادشاہ ادھر سے آنکلے۔ اتفاقاً اس وقت کوئی ساتھ نہ تھا۔ معلوم نہیں کیا جی میں آیا، آپ نے اسے جگا دیا۔ وہ سپاہی یوں ہی نیند سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ جہاں پناہ پر نگاہ پڑی پہلے تو گھبرا گیا مگر پھر ایک ہی مرتبہ سنبھل کے اپنی حالت کو دیکھا فوراً تلوار نذر کی۔ بادشاہ اس تلوار کی تعریف کی اور میان میں کر کے اپنی کمر میں لگالی۔ خود بھی جو والاتی باندھتے ہوئے تھے جس کا طلائی قبضہ تھا، مع کمر مرصع اُس کو حوالے کی۔ اسی موقع پر حضور عالم (خطاب علی نقی خاں وزیر اودھ) آگئے۔ جہاں پناہ نے اس جوان اور اس تلوار کی تعریف کی۔

بادشاہ:۔ دیکھنا بھئی کیا سجیلا جوان ہے اور تلوار بھی اس کے پاس کیا ہی عمدہ تھی۔

(کمر سے تلوار کھول کے) یہ دیکھو۔

وزیر:۔قبلۂ عالم۔سبحان اللہ! مگر حضور سا جوہر شناس اور قدر دان بھی تو ہو جب ایسے لوگ اور ایسی چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔

بادشاہ:۔مگر دیکھنا بھئی! میری تلوار بھی کچھ ایسی بد زیب نہیں ہے۔

وزیر:۔ظلِ سبحانی کی تلوار اور بد زیب؟

بادشاہ:۔مگر لباس اس کے مناسب نہیں ہے۔

اس اثناء میں اور مصاحب ملازم شاہی، چوب دار، خاص بردار آ گئے۔اچھا خاصہ مجمع ہو گیا۔

وزیر:۔درست ارشاد ہوا۔

بادشاہ:۔اچھا ہمارے کپڑے تو اسے پہنا کے دیکھے جائیں۔

اس اشارے کے پاتے ہی لوگ دوڑے ،لباس کی کشتیاں ہاتھوں ہاتھ آ گئیں۔بادشاہ نے ملبوس خاص جو اُس وقت پہنے ہوئے تھے، مع مالائے مروارید اور جوڑے نورتن مرصع کار اُسے عنایت کی، آپ اور کپڑے زیب تن کیے۔

جب وہ کپڑے پہن چکا۔

بادشاہ:۔ہاں اب دیکھو۔

وزیر:۔واقعی صورت ہی اور ہو گئی۔

مصاحبین اور حضار بھی تعریفیں کرنے لگے۔

بادشاہ تھوڑی دیر یہاں ٹھہرے۔اب سواری آ گئی تھی۔سوار ہو کے ہوا کھانے چلے گئے۔

سپاہی خوشی خوشی گھر آیا۔جوہری، مہاجن، دلال گویا ساتھ ہی لگے ہوئے تھے۔اسباب آنکا گیا۔سب پچاس ساٹھ ہزار روپے کی مالیت تھی۔

سپاہی کا حال سنیے۔کہیں نجیبوں کی پلٹن میں تین روپیہ کا اسم تھا، رات کو گھر

میں کھانے پر بیوی سے تکرار ہوئی، آپ خفا ہو کے گھر سے نکل گئے۔ رات بھر خدا جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرے صبح ہوتے موتی محل کے پاس تھک کے بیٹھ گئے۔ نیند آ گئی۔ صبح کو طالع بیدار نے جگایا تو یہ کرشمہ نظر آیا دم بھر میں محتاج سے غنی کر دیا۔

اس طرح کے واقعے شاہی میں اکثر ہوا کرتے تھے اور ایسے ہی زمانے میں ان کا ہونا ممکن ہے جو کہ عنانِ حکومت ایک شخص کے ہاتھ میں ہو اور کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہ ہو۔ ملک کو اپنی مِلک اور خزانے کا اپنا مال سمجھے۔

انگریزی عملداری میں ان فضول خرچیوں کی گنجایش نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کی بے انصافی سمجھی جاتی ہے کہ کسی شخص کو بلا وجہ بلا استحقاق ایک رقم کثیر دے دی جائے۔ ایسی سلطنت جس میں بادشاہ سے لے ایک فقیر تک قانون کے پابند ہیں اگر استحقاق کا لحاظ نہ رکھا جائے تو ہرگز کام نہ چلے۔ اس زمانے میں تقدیر کا زور نہیں چلتا، جو کچھ ہوتا ہے تدبیر سے ہوتا ہے۔

نواب چھٹن صاحب کا حال سنیے۔ (اثنائے سوانح عمری میں ان کا بقیہ ذکر فروگذاشت ہو گیا تھا) درحقیقت آپ دریا ڈوبنے گئے تھے۔ اس ارادے سے غوطہ لگایا کہ اب نہ ابھریں گے مگر جان بہت پیاری چیز ہوتی ہے جب دیر تک پانی کے نیچے رہے دم گھبرانے لگا۔ جی میں آیا اب کی ابھر کر پھر سانس لے لیں۔ ابھرے پانی کی سطح پر آ کر بلا قصد ہاتھ پاؤں چلنے لگے پھر مرنے کو جی چاہا۔ پھر غوطہ مارا۔ پھر وہی حال ہوا۔ اسی طرح کئی غوطے لگائے مگر ڈوبتے نہ بن پڑا۔ آخر اسی کوشش میں بہتے بہاتے چھتر منزل تک پہونچ گئے۔ اتفاقاً اس وقت مرزا ولی عہد بہادر مرحوم مع اپنے چند مصاحبوں کے بجرے پر سوار ہو کر سیر کو نکلے تھے۔ ان کی نظر جو پڑی، سمجھے کوئی شخص ڈوب رہا ہے۔ ملاحوں کو حکم دیا جلدی نکالو۔ انھوں نے چھڑانے کی بہت کوشش کی۔ وہ لوگ سمجھے تھے گھبرا گئے ہیں۔ آخر زبردستی کنارے پر لائے۔ مرزا ولی

عہد نے اپنے سامنے طلب کیا۔ احوال پرسی کے بعد معلوم ہوا کہ رئیس زادے ہیں۔ کپڑے مرحمت ہوئے۔ ہمراہ کوٹھی میں لیے جائے گئے۔

چھٹن صاحب ایک تو خوش رُو جوان دوسرے ادب قاعدے سے واقف، علم مجلس سے آگاہ، کسی قدر خواندہ بھی تھے۔ طبیعت میں مذاق بھی تھا۔ غرض کہ ہر طرح شاہزادے کی صحبت کے لائق تھے فوراً مصاحبوں میں اسم ہوگیا۔ بیش قرار مشاہرہ ہوا۔ اخراجات ضروری کے لیے کچھ مد پیشگی میں مل گیا۔ نوکر چاکر سواری سب سرکار سے مرحمت ہوا۔ لیجیے پھر کیا تھا پہلے سے زیادہ ٹھاٹھ ہو گئے۔

اب جو چوک میں نکلے تو جلوس ہی اور تھا۔ ہاتھی پر سوار ہیں۔ پچاس خاص بردار آگے دوڑے چلے جاتے ہیں۔

بسم اللہ نے اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پہلے تو یقین نہ آیا۔ کہیں میاں مخدوم بخش بھی پیچھے پیچھے چلے آتے تھے، ان کو اشارے سے بلا لیا۔ مفصل حال معلوم ہوا۔

اسکے بعد چچا نے بھی میل کر لیا۔ شادی بھی ہوگئی۔ شادی میں ہم لوگ بھی بلائے گئے تھے۔ خانم کو بہت عمدہ دوشالہ رومال دیا مگر اس دن سے نہ کبھی ہمارے مکان پر آئے نہ بسم اللہ سے رسم رکھا۔ خانم نے اور چال چلی تھیں، بن نہ پڑی، الٹی ہوگئی۔

خلاصہ یہ کہ شاہی میں اس قسم کے کرشمے نظر آجاتے تھے۔ بھلا انگریزی حکومت میں یہ کہاں۔ وہ دن گئے۔ خلیل خاں فاختہ اڑا گئے۔ سنتے چلے آئے ہیں کہ دولت اندھی ہے مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی حکمت سے اس کی آنکھیں کھول دی گئی ہیں۔ اب اُسے لائق اور نالائق کا خیال ہوگیا ہے۔

شاہی عملداری میں جاہل ناخواندہ جو الف سے نام لٹھا نہیں جانتے تھے، بڑے بڑے عہدوں پر نوکر تھے۔ میں کہتی ہوں ان سے کام کیونکر چلتا ہوگا اور تو اور

موے خواجہ سراؤں کے پاس پلٹنیں اور رسالے تھے۔ بھلا انصاف کیجیے۔ ہنسنے کی بات ہے یا نہیں۔

غرض کہ تقدیر کا دور دورہ رہ گیا اور تدبیر کا عہدِ حکومت آیا۔ اب جوہر ذاتی پوچھا جاتا ہے اور جوہرِ ذاتی کی دلالہ شہرت ہے۔ آپ لکھے پڑھے، لائق فائق ہوں مگر جب آپ کو کوئی جانتا ہی نہیں۔

تقدیر اور تدبیر کے مسئلے میں میں بہت دن چکر میں رہی آخر معلوم ہوا کہ جن معنوں میں لوگ اس لفظ کو استعمال کر رہے ہیں وہ بالکل دھوکا ہے۔ اگر اس سے یہ مراد کہ خدا کو ہماری سب باتوں کا علم ازل سے ہے تو اس میں کچھ شک نہیں وہ کافر ہے جس کو اس کا اعتقاد نہ ہو مگر لوگ تو معاذ باللہ اپنے تمام افعال ناشائستہ کے برے نتائج کو تقدیر کی طرف نسبت دیا کرتے ہیں اس سے خدا کی قدرت پر الزام آتا ہے یہ بالکل کفر ہے۔

افسوس جن باتوں کو میں اب سمجھی، اگر پہلے ہی سے سمجھ گئے ہوتی تو بہت اچھا ہوتا مگر نہ کوئی سمجھانے والا تھا اور نہ خود اتنا تجربہ تھا کہ آپ ہی سمجھ لیتی۔ مولوی صاحب نے جو دو حرف پڑھا دیے تھے وہ میرے بہت کام آئے۔ (خدا ان کے درجات عالی کرے) اس زمانہ میں مجھے اس کی قدر نہ تھی۔ تن آسانی اور آرام طلبی کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ علاوہ اس کے قدردان اس قدر تھے کہ کسی وقت فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ جب وہ دن آئے کہ قدردان ایک ایک کھسکنے لگے تو ذرا مجھے مہلت ملی، اُس زمانہ میں کتب بینی کا شوق بڑھا کیونکہ سوائے اس کے اب کوئی شغل نہ رہا تھا۔

میں سچ کہتی ہوں کہ اگر یہ شوق نہ ہوتا تو اب تک میں زندہ نہ رہتی۔ جوانی کے ماتم اور اگلے قدردانوں کے غم میں کب کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ کچھ دنوں تو میں قصے کہانی کی کتابوں سے دل بہلایا کی۔ ایک دن پرانی کتابیں دھوپ دینے کے لیے

نکالیں۔ اُن میں وہ گلستاں بھی نکلی جو مولوی صاحب سے پڑھی تھی ادھر سے اُدھر سے ورق الٹ پلٹ کے پڑھنے لگی۔ پہلے تو مجھے نفرت سی ہوگئی تھی۔ ایک تو اس لیے کہ تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا، عبارت مشکل معلوم ہوتی تھی۔ دوسرے تجربہ نہ تھا اس لیے کچھ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اب جو پڑھا تو وہ دقتیں دور ہو چکی تھیں۔ خوب ہی دل لگا کے میں نے شروع سے آخر تک کئی مرتبہ پڑھا۔ فقرہ فقرہ دل میں اترا جاتا تھا۔ اس کے بعد ایک صاحب سے اخلاقِ ناصری کی تعریف سن کے اسکے پڑھنے کا شوق ہوا۔ انھیں سے ایک نسخہ منگا کے پڑھا۔ واقعی اس کتاب کے مطالب بھی مشکل ہیں اور عربی لفظیں کثرت سے ہیں، اس لیے اس کے سمجھنے میں بہت دقت ہوئی مگر تھوڑا تھوڑا پڑھ کے بہت دنوں میں کتاب کو ختم کیا، پھر دانش نامہ غیاث منصور، نولکشور کے مطبع میں چھپا، اسے پڑھا۔ پھر ایک مرتبہ صغریٰ کبریٰ کو بجائے خود مطالعہ کیا اور جو جو نہ سمجھ میں آیا اُسے پوچھ لیا۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے دنیا کے بھید مجھ پر کھلتے جاتے ہیں۔ ہر بات کی سمجھ آ گئی۔ اس کے بعد میں نے بہت سی کتابیں اس قسم کی اردو فارسی بجائے خود پڑھیں، اس سے طبیعت کو جلا ہوتی گئی۔ قصائد انوری وخاقانی جستہ جستہ پڑھے مگر جھوٹی خوشامد کی باتوں میں اب میرا دل نہ لگتا تھا اس لیے ان کو بند کر کے الماری میں رکھ دیا۔ فی الحال کئی اخبار بھی میرے پاس آتے ہیں انھیں دیکھا کرتی ہوں۔ انسے دنیا بھر کا حال معلوم ہوتا رہتا ہے کفایت شعاری کی وجہ سے میرے پاس اب بھی اس قدر اندوختہ ہے کہ اپنی زندگی بسر کر لے جاؤں گی۔ وہاں کا اللہ مالک ہے۔ میں بہت دن ہوئے سچے دل سے توبہ کر چکی ہوں اور حتی الوسع روزہ نماز کی پابند ہوں۔ رہتی رنڈی کی طرح ہوں، خدا چاہے، جلائے، مجھ سے پردہ میں گھٹ کے نہ بیٹھا جائے گا مگر پردہ والیوں کے لیے دل سے دعا گو ہوں۔ خدا اُن کا راج سہاگ قائم رکھے اور رہتی دنیا تک ان کا پردہ رہے۔

اس موقعہ پر میں اپنی ہم پیشہ عورتوں کی طرف مخاطب ہو کے ایک نصیحت کرتی ہوں چاہیئے کہ وہ اپنے دل پر نقش کر لیں۔

اے بے وقوف رنڈی کبھی اس بھلاوے میں نہ آنا کہ کوئی تجھ کو سچے دل سے چاہے گا۔ تیرا آشنا جو تجھ پر جان دیتا ہے، چار دن کے بعد چلتا پھرتا نظر آئے گا۔ وہ تجھ سے ہرگز نباہ نہیں کر سکتا ورنہ تو اس کے لائق ہے۔ سچی چاہت کا مزہ اسی نیک بخت کا حق ہے؟ جو ایک کا منہ دیکھ کے دوسرے کا منہ کبھی نہیں دیکھتی۔ تجھ جیسی بازاری شفتل کو یہ نعمت خدا نہیں دے سکتا۔ خیر میری تو جیسی گزرنا تھی گذر گئی اب میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔ جے دن دنیا کی ہوا کھانا ہے کھاتی ہوں۔ میں نے اپنے دل کو بہر طور سمجھا لیا ہے اور میری کل آرزوئیں پوری ہو چکیں، اب کسی بات کی تمنا نہیں رہی اگرچہ یہ آرزو کمبخت وہ بلا ہے کہ مرتے دم تک دل سے نہیں نکلتی۔ مجھے امید ہے کہ میری سوانح عمری سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہو گا۔ اب میں اپنی تقریر کو اس شعر پر ختم کرتی ہوں اور سب سے امیدوارِ دعا ہوں۔

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی

THE END---------------تمام شد